ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقیدی و تخلیقی جہات

(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار

نادیہ حفیظ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر ۲۰۱۶ء

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقیدی و تخلیقی جہات

(تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار:

نادیہ حفیظ

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

دسمبر ۲۰۱۶ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقیدی و تخلیقی جہات

پیش کار: نادیہ حفیظ رجسٹریشن نمبر: 953/M.Phil/Urdu/S14

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر رخشندہ مراد ____________________
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر ریاض احمد گوندل ____________________
ڈائریکٹر جنرل

____
تاریخ

اقرار نامہ

میں نادیہ حفیظ حلفیہ بیان کرتی ہوں اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مُراد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

نادیہ حفیظ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۱۶ء

فہرست ابواب

مقالے کا دائرہ کار

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی مختلف علمی و ادبی حیثیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا تحقیقی و علمی مرتبہ متعین کرنے میں ان کی تصنیفات اور تحقیقات کو شامل کیا گیا ہے اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے احوال و آثار سے لے کر ان کے تحقیقی و تنقیدی موضوعات اور ان کی اپنی ادبی تخلیقات سب کو سمیٹا گیا ہے۔ ان کی تحقیق ان کی شاعری، تنقید، افسانے، سفر نامے ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب بحثیت مترجم اور ان کی ادارتی خدمات کو بھی مد نظر رکھ کر ہر ممکن اس مقالے کو مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے فن کے مختلف گوشوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ABSTRACT

TOPIC: The Literary and Criticism Contribution of Dr Najeeba Arif

I have attempted to analyses, evaluate and appreciate the outstanding contribution of Dr Najeeba Arif to literary criticism and research in urdu, she introduced the modern western literary culs and trends through her work of translation into urdu Dr Najeeba Arif is poet, essayist, editorial, short story writer and critic, she has produced almost 7 books and her books relate to the literary criticism in urdu. Her fame is primarily based on her {Mumtaz Mufti ka fikri irtaqa}

I have divided my study into six chapters first chapter gives on over view of the person and the biography of the writer and her carrier have been discussed .2nd chapter gives an over view of the origin and development literary criticism into urdu up to the time when Dr Najeeba Arif entered into the realm of urdu criticism.3rd chapter I have tried to give a criticism appreciation of Dr Najeeba Arif work several volumes of collected essays.4th chapter is appreciation of her amazing work as a translator and editoral.5th chapter is also her own creative literary work. six and last chapter present a comprehensive of an overview of Dr Najeeba Arif contribution of literary research in urdu literature finding and recommendations.

مقالے کا مقصد

دورِ حاضر میں لکھنے والوں میں اہم نام ڈاکٹر نجیبہ عارف کا بھی ہے جن کی تخلیقی جہات مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔انہوں نے اپنے فن کی ابتدا اپنی شاعری سے کی لیکن محقق اور نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اس کے ساتھ ساتھ آپ افسانہ نگار سفر نامہ نگار مترجم، مدیر کے طور پر بھی سامنے آئی ہیں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کے تحقیقی و تنقیدی کام کی وسعت اردو کے ہر بلند پایہ محقق کے برابر ہے۔

میرے اس مقالے کا مقصد اردو میں تحقیق وتنقید کا دائرہ عمل وسیع کرنا اور ڈاکٹر نجیبہ عارف کے علمی کارناموں کو اردو ادب میں جگہ دینے کی کوشش کرنا ہے اس مقالے کی افادیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی تقریباً تمام تصانیف وتالیفات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا ابھی تک کسی بھی سطح پر مقالہ نہیں لکھا گیا۔اپنے اس مقالے میں میں نے ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقیدی وتخلیقی جہات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اس مقالے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی تمام جہات کو سامنے لایا جائے اور معاصر اردو ادب میں ان کے مقام کو متعین کیا جائے۔

اس تحقیقی مقالے دوران درج ذیل سوالات میرے پیش نظر رہے ہیں:

۱۔ نجیبہ عارف کی تحقیق وتنقید کا معیار کیا ہے؟

۲۔ نجیبہ عارف کی بحیثیت تخلیقی ادیب معیار اور انفرادیت کیا ہے؟

۳۔ معاصر ادبی منظر نامے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی انفرادیت کا تعین کرنا۔

اظہارِ تشکر

میرے ایم فل کے اس مقالے کی تکمیل کے تمام مراحل میں جن اداروں اور شخصیات نے میری معاونت کی حوصلہ بڑھایا اور دعاؤں میں یاد رکھا، ان سب کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تحقیق گویا ایک مشکل طلب کام ہے اور کم توفیقی کے باوجود میں اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئی ہوں۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی کرم نوازی ہے اور اس مہربانی پر میں اللہ پاک کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے۔

اس مقالے کا موضوع ڈاکٹر رخشندہ مُراد اور ڈاکٹر روبینہ شہناز نے تجویز کیا ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں نے اپنا تحقیقی کام مکمل کیا اس مقالے کی تکمیل کے لئے اگر میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ ایک طرح سے ناانصافی ہوگی تصانیف کی فراہمی سے لے کر مقالے کے اختتام تک ان کی شفقت رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہر قدم پر میرے ہمراہ رہی اس دوران ان سے کئی دفعہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور جس طرح انہوں نے میری مدد کی اس کے لئے میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کیونکہ جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آئی تو انہوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لئے میری دوست فوزیہ بہن بھائیوں نے جس طرح میرے ساتھ تعاون کیا میں ان کی احسان مند ہوں۔ یہ ان کی بے شمار اور بے مثال محبتوں کا ثمر ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔

مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میرے امی ابو نے بہت تعاون کیا اور ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ اللہ کے کرم سے میں یہ مقالہ مکمل کر پائی۔ میں اپنے والدین کی ممنون احسان رہوں گی جنہوں نے ایم فل میں داخلے سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میرا قدم قدم پر ساتھ دیا اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے اور ان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رکھے۔ (آمین)

نادیہ حفیظ

باب اول

ڈاکٹر نجیبہ عارف: سوانح اور شخصیت

سوانح و شخصیت:

پاکستانی ادب میں خواتین نے ادب اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تمام شعبہ ہائے زندگی میں جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ سراہے جانے کے قابل رہی ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا شمار بھی ان خواتین میں ہوتا ہے جو بلاشبہ اپنے آپ میں ایک بڑا نام ہیں نجیبہ عارف ایک نمایاں اور منفرد ادبی شخصیت کی حامل ہیں ان کی ادبی شخصیت کی کئی اہم جہات ہیں وہ بیک وقت شاعرہ، ادیبہ، اور ماہر تعلیم ہیں انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

نجیبہ عارف ۲۴ ستمبر ۱۹۶۴ء کو ضلع خوشاب کے ایک پسماندہ قصبے میں پیدا ہوئیں جو جنوبی پنجاب کے کنارے پر واقع ہے آپ کے والد کا خاندان امرتسر سے ہجرت کر کے آیا والدہ سید خاندان سے تعلق رکھتی ہیں والدہ کے خاندان نے ہشیار پور سے ہجرت کی نانی کا تعلق وادی سون سکسیر کے گاؤں انگہ سے ہے اور وہ رشتے میں معروف شاعر احمد ندیم قاسمی کی کزن ہیں والدہ نے اپنی ملازمت کا آغاز بحثیت استاد گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب سے کیا۔ بعدازاں گورنمنٹ ایلمنٹری کالج میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیے اور وہیں سے ریٹائیر ہوئیں۔ والد صاحب نے مختلف ملازمتیں کیں پہلے ان کے والد صاحب ائیر فورس میں ملازم تھے۔ آپ کی پیدائش کے وقت سول ایوی ایشن اتھارٹی لاہور میں تعینات تھے۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت چھوڑ دی کئی سال تک کاروبار کرنے کی کوشش کرتے رہے ناکام ہونے کے بعد بحرین چلے گئے۔ اور ایک نجی کاروباری ادارے میں مالیاتی و انتظامی امور کے نگران مقرر ہوئے۔ پچیس سال بحرین میں ملازمت کرنے کے بعد ریٹائیر ہو کر وطن واپس آ گئے اور جوہر آباد میں مقیم ہو گئے ۲۰۰۴ء میں اسلام آباد منتقل ہوئے اور یہیں ۱۱ جنوری ۲۰۱۱ء کو انتقال ہوا۔ اسلام آباد کے سیکٹر H-11 قبرستان میں مدفون ہیں۔ نجیبہ عارف کے دو بہن بھائی ہیں۔ بہن ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہیں بھائی نے کمپیوٹر میں ایم۔ سی۔ ایس کیا ہے اور کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہیں۔ نجیبہ عارف کا بچپن اپنے

گاؤں میں ہی دوسرے بچوں کی طرح ہی گزرا ان کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کے خاندان میں ان کے علاوہ کوئی اور لکھاری نہیں ہے۔ بقول نجیبہ عارف:

''ان کے دودھیالی رشتہ داروں میں کوئی بھی لکھاری نہیں ہے لیکن ننھیالی رشتہ داروں میں احمد ندیم قاسمی جو کہ ہمارے ملک کا بہت بڑا نام ہیں ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔''(۱)

نجیبہ عارف نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع خوشاب سے ہی حاصل کی جوہرآباد سے ایف۔ایس۔سی کی سرگودھا کالج سے بی۔اے کیا جن اساتذہ سے انھوں نے پڑھا ان کے بارے میں بتاتی ہیں۔

''میں نے اس پسماندہ علاقے میں ایسے اساتذہ سے پڑھا جنہوں نے میری ایسی تربیت کی کہ بعد میں جب لاہور، اسلام آباد یا پھر اپنے ملک سے باہر یونیورسٹیوں میں کبھی جانا ہوا تو مجھے کبھی کسی کے سامنے شرمندگی یا احساس کمتری کا احساس نہیں ہوا۔ اگرچہ ہمارے اساتذہ ایسے تھے جن کا انگریزی کا تلفظ شاید اتنا اچھا نہیں تھا مگر انھوں نے ہمیں انگریزی لکھنا پڑھنا سکھا دی حقیقتاً یہ ایسے استاد تھے جو شاگرد کی شخصیت کے ہر پہلو کی تربیت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے محنت کرتے تھے اور پڑھانے کے لئے اپنی جان مارتے تھے۔''(۲)

نجیبہ عارف بتاتی ہیں کہ اگرچہ انھوں نے لکھنے کا آغاز شاعری سے کیا اور شاعری میری پہلی محبت ہے اور پہلی محبت کو عموماً بڑے ہو کر بھول جاتے ہیں اور لکھنے کا آغاز چھٹی یا ساتویں جماعت سے کر دیا تھا لکھنے کا شوق بھی اس وجہ سے ہوا تھا کہ ہمارے سکول میں تحت اللفظ، بیت بازی اور کلام اقبال پروگرامز ہوا کرتے تھے اور ہم اشعار کی پریکٹس کرتے تھے جس سے شوق پیدا ہوا اور خود بھی لکھنا شروع کیا کہ شاید ہم بھی کچھ لکھ سکیں یا کچھ کر سکیں۔ اپنے سکول کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

''میں اگر کسی کی ممنون ہوں تو وہ میرے سکول کی ہیڈ مسٹریس مس عنایت تھیں کیونکہ انھوں نے اس چھوٹے سے قصبے میں ہر طرح کی کتاب ہمیں لائبریری میں فراہم کر

دی تا کہ ہم وہ کتابیں پڑھیں ان کا نام مس عنایت تھا تو وہ سچ میں عنایت تھیں اور
میں سمجھتی ہوں علمی زندگی میں اپنے والدین کے بعد اگر کسی کی ممنون ہوں تو وہ
میرے اساتذہ ہیں۔'' (۳)

نجیبہ عارف نے پہلا افسانہ لکھا اور اپنی امی کے ڈر سے لکھ کر پھاڑ دیا کہ چھوٹی سی ہے اور رومانوی باتیں لکھتی ہے اور اسے بھی پتا ہے رومانوی باتیں کیا ہوتی ہیں پھر امی نے مس عنایت کو بتایا تو انھوں نے میری پہلی دفعہ حوصلہ افزائی کی اور مجھے خواتین کے ایک رسالے کا پتا لا کر دیا اور کہا اس رسالے میں اپنا افسانہ بھیجو پھر بعد میں اس افسانے پر مجھے انعام بھی ملا۔ بقول نجیبہ عارف: ''ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جنہوں نے میری زندگی پر بہت سے اثرات ڈالے۔'' (۴)

اگرچہ نجیبہ عارف کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہ غیر معمولی حد تک تعلیم سے محبت کرنے والا گھرانہ تھا ان کی نانی جو کبھی سکول بھی نہیں گئیں تھیں اس کے باوجود انھوں نے خاندان سے بغاوت کر کے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی شاید یہی وجہ تھی کہ آگے ان کے بچوں نے بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی۔نجیبہ عارف جیسی شخصیت کو دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تعلیم ان کے خاندان کی پہلی ترجیح رہی ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تعلیم ان کے خاندان کی پہلی ترجیح رہی ہے اور یہ بھی ہر عورت کے نصیب میں نہیں ہوتا کہ سسرال اور میکے دونوں طرف سے تعاون حاصل ہو اس معاملے میں نجیبہ عارف خوش قسمت ہیں کہ انھیں ہر طرح کا تعاون حاصل رہا۔

کالج کے زمانے سے ہی نجیبہ عارف اپنے کالج کی ہیڈ گرل رہیں اور اپنے کالج کو لیڈ کرتی رہیں اس حوالے سے ملک کے مختلف حصوں میں کالجوں میں جانا ہوتا تھا وہ مزید بتاتی ہیں کہ اگر ہم کسی ٹیم کے ساتھ کسی کالج میں گئے ہوتے اور پھر وہیں پر کسی اور کالج کا دعوت نامہ آ جاتا تو وہاں سے ہی ہم دوسرے کالج چلے جاتے۔کالج کے واقعات کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ویسے تو بہت سے واقعات ہیں لیکن ایک واقعہ جو ان کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

''حمیدہ شاہین جن کا تعلق لاہور سے ہے اور معروف شاعرہ بھی ہیں وہ میری کالج فیلو
بھی رہیں اور بہت اچھی دوست بھی ہیں ہم یونیورسٹی پڑھتے تھے ایک دفعہ اسے
وہاڑی میں مشاعرے کا بلاوا آ گیا ہم بس پر سوار ہو گئے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ

وہاڑی کس جگہ واقع ہے جب ہم وہاں پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے اور تانگے
پر بیٹھ کر مشاعرہ ہال میں پہنچنا تھا ہم بہت پریشان ہوئے ہمارے پاس ایک نیل
کٹر تھا اس کا ہی چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور بڑی بہادری سے تانگے پر بیٹھ کر
مشاعرہ ہال میں جا پہنچے اب سوچتی ہوں تو بڑی حماقت لگتی ہے اور یقین نہیں آتا کہ
اس وقت کیسا کھلنڈرا پن تھا کہ ہم نے ایسی بہادری کی حماقت کی۔'' (۵)

حمیدہ شاہین جن کا ذکر نجیبہ عارف نے بہت خوبصورتی اور پیار سے اپنی گفتگو میں کیا ہے دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے بہت اچھی طرح جانتی ہیں اور آپس میں گہری دوستی بھی ہے۔حمیدہ شاہین نجیبہ عارف کے ساتھ گزارے ہوئے خوبصورت لمحوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

''نجیبہ سے میرا تعلق کس سطح پر، بلکہ کس کس سطح پر ہے یہ کھوجنے کے لئے مجھے خود سے
تفصیلی انٹرویو کرنا پڑے گا یہ ربع صدی کا قصہ ہے سوچتی ہوں کیسے اور کتنے الفاظ
میں سمٹ پائے گا وہ ہمیشہ الفاظ سے زیادہ رہی ہے اور معانی سے زیادہ ہونے کی لگن
میں سرشار پھرتی ہے۔دکھوں سکھوں کی دوڑ میں ایک دوسرے سے جڑے رہنے کی
کوشش، ہم اکھٹے بہت ہنسے بہت روئے ویگنوں بسوں ٹرینوں میں غزلیں جوڑیں
اکٹھے بیٹھ کر تقاریر لکھیں اور سٹیج پر ایک دوسرے کی مخالفت میں دھواں دار بھی ہوئے۔
یہ سب مناظر اب کسی خاموش فلم کی طرح نظر سے گزر رہے ہیں۔''(۶)

نجیبہ عارف کے مطابق ہر دور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے ایک دور تھا جب شاعری کا دور تھا پھر افسانہ کا،ان کو ادب سے زیادہ تاریخ میں لگاؤ ہے ان کو تاریخی کتابیں پڑھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔اور تحقیق میں دلچسپی کی وجہ بھی یہی ہے کہ تحقیق میں ان کا بنیادی موضوع ان رجحانات کا کھوج لگانا ان واقعات کو سمجھنا اور ان کی حقیقت اور معنویت کے اسباب اور نتائج کو دیکھنا جنھوں نے ہماری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے موجودہ دور میں تاریخ اب ان کا زیادہ پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ان کا تعلیمی ریکارڈ شروع سے ہی بہت اچھا رہا ہے انھوں نے اپنے تعلیمی کیریئر کے دوران بہت سے تمغے اور ایوارڈ حاصل کیے۔

ملازمت:

دورانِ تعلیم ہی ان کی ملازمت ہوگئی تھی اور اردو استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ ایلیمنٹری ٹیچرز ٹریننگ کالج جوہر آباد میں ۱۹۸۸ء میں بطور لیکچرار تعینات ہوئیں وہاں ۱۹۹۲ء تک تدریس کے فرائض سرانجام دیئے ۱۹۹۲ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور بطور لیکچرار آف اردو و ادب شعبہ اردو فیڈرل گورنمنٹ کالج برائے خواتین F 7/2 اسلام آباد میں تعینات ہوئیں ۲۰۰۴ء تک وہاں تدریس کے فرائض انجام دیئے ۲۰۰۴ء میں ان کی ترقی ہوگئی اور بطور اسسٹنٹ پروفیسر انچارج پوسٹ گریجویٹ سلیکشن کی حیثیت سے اسلام آباد ماڈل کالج برائے خواتین F 7/4 اسلام آباد میں تعیناتی ہوئی تین سال تک یہاں اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ ۲۰۰۷ء میں اسسٹنٹ پروفیسر اور شعبہ اردو کی انچارج کی حیثیت سے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے منسلک ہوئیں وہاں صدر شعبہ اردو کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی یونیورسٹی کے رسالے (معیار) کی ایڈیٹر بھی ہیں۔

شخصیت کے حوالے سے نجیبہ عارف کا اندازِ گفتگو نرم اور دھیما ہے اور مسکراہٹ ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ مہمان نواز ہیں اتنا بلند مقام حاصل کرنے کے باوجود بھی ان کی شخصیت میں مٹھاس اور دوستانہ لہجہ ہے ان کا حلقہ احباب بھی وسیع ہے جس سے بھی ملتی ہیں اس کو بہت عزت دیتی ہیں پہلی بار ملنے سے بھی لگتا ہے کہ آپ کا ان سے بہت پرانا رشتہ ہے اور تعلق ہے ان کی شخصیت کے حوالے سے یہ پہلو بہت اچھا لگا کہ وہ ہر بات کو بڑے اچھے انداز میں بیان کرتی ہین اور وضاحت کے ساتھ اپنی بات مکمل کرتی ہیں۔ان کے شخصیت کے حوالے سے شیراز فضل کہتی ہیں:

> ''ڈاکٹر نجیبہ عارف بطور استاد انتہائی منظّم اور محنتی ہیں بوقت ضرورت وہ طالبعلموں سے سختی بھی کرتی ہیں لیکن پڑھائی کے میعار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتیں بطور انتظامی افسر کے بہت شفیق ہیں کئی برسوں سے صدر شعبہ ہیں لیکن میں نے آج تک ان کو کسی سے سخت لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا وہ ٹیم ورک پر یقین رکھتی ہیں شعبہ کا کوئی بھی فیصلہ تمام اراکین سے مشاورت کیے بغیر نہیں کرتیں''۔(۷)

حمیرا اشفاق انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی میں ان کی ساتھی ہیں وہ ان کے بارے میں کہتی ہیں۔

''ڈاکٹر نجیبہ عارف دور حاضر میں خواتین ادیبوں میں میری آئیڈیل ہیں میں نے ہمیشہ ان کی طرح بننے ان کی طرح لکھنے اور ان کی طرح جستجو کی تمنا کی بطور ساتھی استاد میں نے انہیں شفیق اور کاملیت پر یقین رکھنے والا پایا ہے بطور استاد وہ پابندی وقت، علم کی جستجو اور ہمیشہ دیے کے مقام پر فائز نظر آتی ہیں۔'' (۸)

نجیبہ عارف وقت کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات سے متاثر رہیں انھیں مشتاق احمد یوسفی کی نثر اور مختار مسعود کی نثر پسند ہے۔ وہ کسی زمانے میں ممتاز مفتی سے بہت متاثر رہیں شخصی طور پر بھی ان سے ملتی رہی اور پی۔ ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی ان پر ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ صرف خاتون ہونے کہ وجہ سے کسی کو نظر انداز کرنا نہیں چاہیے اور اگر ہم دیکھیں تو خواتین کے لئے اتنا نہیں لکھا جا رہا جتنا مرد حضرات کے لئے لکھا جا رہا ہے لیکن پھر بھی ہمارے ہاں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اگر کوئی شخص اپنے مرد ہونے یا عورت ہونے کے احساس سے باہر نہیں نکل پا رہا ہوا گر اس سے نکل کر لکھتا ہے تو وہ ذات کے اندر ڈوب جاتا ہے وہ نہ مرد ہے نہ عورت تو یہ تشخیص بے معنی ہے۔ بقول نجیبہ عارف:

''حقیقت اپنی ذات کے اندر نہ مذکر ہے نہ مئونث تو ہمارے اندر جو چیز بول رہی ہے تو وہ نہ مرد ہے نہ عورت اس کی کوئی صنف نہیں۔''(۹)

نجیبہ عارف کو اپنا حوالہ جو سب سے زیادہ پسند ہے اس حوالے سے کہتی ہیں کہ ماں ہونا اچھا لگتا ہے اس کے بعد بیوی اور علمی حوالے سے استاد ہونا اس کے بعد سب سے اہم بات پڑھنا، لکھنا۔ نجیبہ عارف کی شادی ۱۹۹۲ء میں محمد عارف جمیل سے ہوئی اس شادی میں فریقین کی پسند اور دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی شامل تھی۔ شوہر نے لندن سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے اور اسلام آباد کے ایک نجی ادارے میں ڈائیریکٹر ایڈمنسٹریشن و فنانس کے عہدے پر فائز ہیں۔ شوہر نے تعلیمی و ادبی میدان میں قدم جمانے میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور ہر طرح کی سہولت اور تعاون بہم پہنچایا اس کے نتیجے میں پیشہ وارانہ زندگی میں بھی کسی گھریلو رکاوٹ یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شوہر سے مثالی ہم آہنگی اور رفاقت کا رشتہ قائم ہے۔ ان کی زندگی کا حسین لمحہ وہ ہے جب انھوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا ان کے دو بچے ہیں مومنہ عارف جونسٹ سے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور بیٹا محمد بن عارف

کامسیٹیس یونیورسٹی اسلام آباد سے سوفٹ وئیر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ان کے بقول ان کو غصہ آتا ہے کبھی کنٹرول ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں اپنی زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوئیں مایوسی کی وجہ ہی کوئی نہیں ہے اور شاید ان کی زندگی میں امید کا پہلو ہمیشہ رہتا ہے ایک لکھاری کی حیثیت سے کہتی ہیں:

''لکھتے ہوئے انفرادی مسئلے بعض واوقات سماجی اور معاشرتی مسائل پر لکھا جاتا ہے کیونکہ معاشرہ ہماری ذات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے اور وہ تحریر ہماری ذات سے چھن کر ہمارے سامنے آتی ہے''۔ (۱۰)

ان کے نزدیک استاد کی حیثیت سے عجیب بات ہے کہ جب آپ کلاس میں مخاطب ہوتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ طالبعلموں کے دل میں جا کر لگتے ہیں مختلف طالبعلموں کے ساتھ مختلف تجربے ہوئے ہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ طالبعلم کتنی دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کے خیال میں ہمارے نئے لکھنے والوں کو اپنی زبان سے زیادہ آشنائی نہیں ہے اتنی مہارت نہیں جو پرانے لکھنے والوں کو ہے۔فکشن اور ادب کے حوالے سے کہتی ہیں:

''فکشن ہو یا ادب کی کوئی اور صنف ہو وہ محض ادب کا موضوع نہیں تاریخ بھی ہوتی ہے کوئی بھی لکھاری اپنی تاریخ سے ناواقف نہیں ہوتا بے خبر نہیں ہوتا جب بھی کوئی نو تاریخ لکھی گئی اس میں صرف حکمرانوں کی فتوحات ، کامیابیاں اور سیاست کے بارے میں لکھا گیا۔عوام کی تاریخ نہیں لکھی گئی عوام کی تارخ ادب میں ملتی ہے ادب اس اعتبار سے تاریخی دستاویز بھی ہے اور مجھے اس حوالے سے مطالعہ کرنا پسند ہے سیاسی ،معاشرتی اور سماجی اعتبار سے مطالعہ کرنا میرا پسندیدہ موضوع ہے۔'' (۱۱)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کہنا ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ ان کی زندگی رائیگاں نہ جائے۔ پاکستان میں خواتین کے بولڈ ہونے کے حوالے سے بھی ان کی سوچ بہت مثبت ہے کیونکہ ان کے نزدیک عورت بھی ایک مرد کی طرح اپنے خیالات کا سچائی کے ساتھ اظہار کر سکتی ہے اور یہ اس کا حق ہے تمام مسائل پر کھل کر بات کرنا کسی بھی انسان کا مکمل حق ہے اور وہ اس حق کو استعمال کر سکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ ہمارے ہاں صرف مخصوص موضوعات پر بحث کرنا اور پھر ان کو بھی تہذیبی اقدار کے پیش نظر رکھ کر ہی بات کی جاتی ہے۔آج کی عورت کہیں سے بھی مرد کی

برابری کرسکتی ہے۔ کیونکہ پاکستان میں ایسا ادب تخلیق ہورہا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر بھی باہر کے مضامین اورادیبوں کے ادب سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

نجیبہ عارف زندگی کے ہر شعبے میں ایک کامیاب شخصیت رہی ہیں وہ ادب کوفروغ دینے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں اوران کی یہ لگن اور محنت بخوبی نظر آتی ہے۔ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ اردو کی سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے دوسری بہت سی ذمہ داریاں بھی اٹھا رکھی ہیں۔ وہ اسلامی یونیورسٹی کے رسالے معیار کی مدیر بھی ہیں اوراس کے علاوہ لٹریری سوسائٹی کی ہیڈ اور ممتاز مفتی ٹرسٹ کی جنرل سیکرٹری ہیں ممتاز مفتی کے حوالے سے جو بھی سیمنار منعقد کرائے جاتے ہیں وہ بھی ان کی ذمہ ہیں۔اس کے علاوہ اسلامی یونیورسٹی میں ادب اور ثقافت کو اجاگر کرنے کے لئے جو پلیٹ فارم بنایا گیا اس کی بنیاد بھی انہوں نے ہی رکھی۔اس کے علاوہ اسلامی یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے بھی مشعل راہ ہیں۔ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے طالبعلموں کے مقالوں کی نگران بھی ہیں۔ان کے زیرنگرانی ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاچکے ہیں اور بہت سے ابھی زیرتکمیل ہیں۔

غرض کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف اپنے آپ میں ایک مکمل ادبی شخصیت ہیں ایسے انسان بہت کم ملتے ہیں ان کے اتنے کام ہیں کہ پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے انہوں نے اپنا آپ علم وادب کوفروغ دینے کے لئے وقف کر دیا ہو۔

تصانیف:

نجیبہ عارف کی بہت سی تصانیف منظرعام پرآ چکی ہیں ان کے ہاں تنقیدی موضوعات زیادہ ملتے ہیں وقتاً فوقتاً شاعری بھی کرتی رہیں جواب کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے۔ان کے دوسفرنامے، تین افسانے بھی مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔بطور محقق اور نقاد ان کوشہرت ملی۔

''ممتاز مفتی شخصیت اور فن'' (۲۰۰۷ء) اس کتاب میں ممتاز مفتی کی سوانح نگاری سے لے کر ان کے تمام ادبی کارناموں پرروشنی ڈالی گئی ہے۔

''رفتہ وآئندہ'' (۲۰۰۸) میں شائع ہوئی یہ کتاب ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے اور بعد میں ان کو کتابی شکل دے دی گئی اس کتاب میں ممتاز مفتی سے لے کر محمد حمید شاہد تک

متعدد ہم عصر افسانہ نگاروں ناول نگاروں کی تخلیقات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

''ممتاز مفتی اور فکری ارتقا'' یہ کتاب (۲۰۱۱ء) میں الفیصل ناشران نے شائع کی یہی کتاب ان کی شہرت کی وجہ بنی۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس کتاب نے ہی ان کو تنقید و تحقیق کی نئی راہوں سے روشناس کروایا اس میں بھی ممتاز مفتی کی شخصیت اور ان کی فکر کے حوالے سے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''۹/۱۱ اور اردو افسانہ'' (۲۰۱۱ء) میں یہ کتاب منظر عام پر آئی یہ انتخاب و تجزیہ ہے اردو فکشن میں گیارہ ستمبر کے جو بھی اثرات پاکستان اور امریکہ میں رونما ہوئے اور اس کا اثر یہاں لکھنے والوں پر بھی ہوا اور اس ضمن میں جو بھی لکھا گیا اس سب کو پیش نظر رکھ کر نجیبہ عارف نے اس کتاب میں ان تمام پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانوں کو شامل کیا اس میں گیارہ ستمبر کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

''بکل دے وچ چور'' یہ کتاب ممتاز مفتی کے متصوفانہ افسانوں پر مشتمل ہے نجیبہ عارف نے اس کتاب میں ممتاز مفتی کے کچھ ایسے افسانے شامل کیے جن میں تصوف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

''تلاش اللہ ماورا کا تعین'' یہ کتاب (۲۰۱۲ء) میں شائع ہوئی۔ یہ عکسی مفتی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ نجیبہ عارف نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ مترجم ہونے کی بھی بخوبی صلاحیت رکھتی ہیں۔

''معانی سے زیادہ'' یہ کتاب (۲۰۱۵ء) میں شائع ہوئی۔ نجیبہ عارف کی یہ شاعری کی کتاب ہے کیونکہ نجیبہ عارف کو بچپن ہی سے شاعری کرنے کا شوق رہا اور انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز بھی شاعری سے ہی کیا تھا۔ اور ان کے خیال میں شاعری ہی ان کی پہلی محبت ہے لیکن ان کی کتاب منظر عام پر ۲۰۱۵ء میں آئی۔ ان کی شاعری، نظمیں، غزلیں مختلف رسالوں میں چھپتی رہیں ان سب کو یک جا کر کے کتابی شکل دی ہے جو میرے مقالے کا حصہ بھی ہے۔

غیر مدون افسانے:

☆ رائیگانی

☆ صدیوں بھرا لمحہ

☆ دشتِ امکاں سے آگے

غیر مدون سفرنامے:

☆ آرے رانگ (جنوبی کوریا کا سفرنامہ)

☆ چہرے یادیں اور خیال (یورپ کا سفرنامہ)

مدیر:

☆ بنیاد (لمز یونیورسٹی لاہور)

☆ میعار (انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد)

ایوارڈز واسناد

☆ ۱۹۷۹ء،۱۹۸۱ء، میں میرٹ سکالرشپ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سکینڈری آف سرگودھا سے ملا۔

☆ ۱۹۸۶ء میں سلور میڈل (ایم اے پبلک ایڈمنسٹریشن) یونیورسٹی آف پنجاب لاہور نے دیا۔

☆ ۱۹۸۷ء میں گولڈ میڈل (ایم اے اردو) یونیورسٹی آف پنجاب لاہور نے دیا۔

☆ ۱۹۹۵ء میں (ایم فل اقبالیات) میں بھی گولڈ میڈل لیا۔

☆ ۱۹۹۹ء میں تھائی لینڈ میں پاکستانی ایمبسی میں یوم اقبال کے موقع پر اقبال کی شاعری اور فلاسفی پر آپ کو انعام سے نوازا گیا۔

☆ ۲۰۰۵ء میں اورینٹل ایجوکیشن ایوارڈ حاصل کیا اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو طالب علموں میں اجاگر کرنے کے لیے منسٹری آف ایجوکیشن گورنمنٹ آف پاکستان سے بھی ایورڈ ملا۔

☆ ۲۰۰۶ء ممتاز مفتی (معمار ادب سیریز) اکادمی ادبیات کی طرف سے بھی انعام دیا گیا۔

☆ ۲۰۰۸ء میں انٹرنیشنل کانفرنسز میں شرکت کی اور انعامی سندیں وصول کیں۔

☆ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء میں کئی بار انٹرنیشنل یونیورسٹیوں میں ورکشاپس اٹینڈ کیں اور کانفرنسوں میں حصہ لیا اور بہت سے ایوارڈز اور عزازی اسناد حاصل کیں۔

☆ ۲۰۱۰ء میں ان کی تنقیدی مضامین کی کتاب رفتہ و آئندہ (اردو ادب کا منظر نامہ) کو انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایوارڈ آف ریسرچ پبلیکیشن ملا۔

☆ ۲۰۱۱ء میں بھی انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک اور ریسرچ پیپر پر ان کو سند دی گئی۔

رسالوں میں چھپنے والے مقالات

☆ ''نوآبادیاتی عہد میں اردو سیرت نگاری رجحانات و اسالیب'' یہ مقالہ کانفرنس پبلیکیشن میں شامل کیا گیا۔

☆ ''فیض کی مقبولیت کے اسباب'' یہ شاعر خوشنوا، لاہور (نستعلیق مطبوعات) ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔

☆ ''Role of language in the devlopment of nationhood'' یہ مقالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی خیر پور میں (ادب اور قومی شعور) ۲۰۱۰ء میں خشک محمد یوسف اور صوفیہ نے شامل کیا۔

☆ ''اردو زبان و ادب کی تاریخ'' برٹش اور اینٹل لسٹس کے حوالہ جات کے ساتھ سہیل سید عامر، احمر، نسیم عباس نے (ادبی تاریخ نویسی) لاہور سے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔

☆ ''ماڈرن کلچر اسلام اور اقبال'' (علامہ اقبال کا تصور اتحاد) لاہور اقبال اکیڈمی پاکستان کے توسط سے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا گیا۔

☆ ''ممتاز مفتی ایک شخصی خاکہ'' (اردو ادب کا مفتی) رائے صدیقی نے ۱۹۹۸ء میں راولپنڈی سے شائع کیا۔

☆ ''مفتی مفتی'' (ماہا او کھا مفتی) ایڈیٹر علی سید محمد نے لاہور فیروز سنز سے شامل کیا۔

☆ ''انٹرویو ممتاز مفتی کے ساتھ'' کرنل بیلا ابدال نے (مفتی جی) میں لاہور فیروز سنز سے شائع کیا۔

کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات:

۱۔ ''اردو زبان کو درپیش مسائل اور جمعیت کا کردار'' 6 t h علمی اردو کانفرنس کراچی، آرٹس کونسل پاکستان، نومبر ۲۰۱۳ء

۲۔ جدید ادب کی جہات، آرٹس کونسل پاکستان کراچی، 6th علمی اردو کانفرنس ۲۰۱۴ء

۳۔ First Hindustani women visitor to Britian خواتین کا عالمی دن کانفرنس UK، مارچ

۲۰۱۳ء

۴۔ Dis-solving the muth, The west in south Asian Muslim Travels Narratives 1767-1857 پاکستان مطالعہ سینٹر سیمینار لندن، ۲۸ فروری ۲۰۱۳ء

۵۔ Going Beyond the Ocean: Early South Asian Muslim visitors to Europe1787-1857 یونیورسٹی آف روم ۲۱ فروری ۲۰۱۳ء

۶۔ The west in South Asian Muslim discourse: A Study of URDU Travel of early Nineteenth Century. یونیورسٹی آف ایڈمبرگ UK، ۳۱ جنوری ۲۰۱۳ء

۷۔ East-West Encounter in the Nineteenth century India: Early indian Muslim visitors to Europe 1787-1857 ہیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی ۱۵ جنوری ۲۰۱۳ء

۸۔ Modern Urdu Short Story: Mystical Aspect یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز لاہور ے اپریل ۲۰۱۲ء

۹۔ Urdu Sirah writing in the Colonial period. اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اسلام آباد، دوروزہ انٹرنیشنل سرہ کانفرنس مارچ ۲۰۱۲ء

۱۰۔ "9/11 and Urdu Literature: Images and illasions" یونیورسٹی آف ویسکونس US، اردو انسانیت کانفرنس ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء

۱۱۔ Iqbal and Clash of Civilizations نیشنل اقبال کانفرنس، نیشنل لینگویج اتھارٹی اسلام آباد، ۵ نومبر ۲۰۱۰ء

۱۲۔ "9/11 and Urdu literature: Fiction and Poetry" لیکچر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۴ جون ۲۰۱۰ء

۱۳۔ "National Integrity and Urdu language" (نیشنل سیمینار)، قومی لینگ وئج اتھارٹی اسلام آباد ۲۵ مئی ۲۰۱۰ء اسلام آباد

۱۴۔ Iqbal and Feminism.دوروزہ انٹرنیشنل کانفرنس، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباداپریل ۲۰۰۹ء

۱۵۔ Restraints of the history and Darlrymples Reflectionsلیکچر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۹ء

۱۶۔ ''اقبال کا تصور تاریخ''، (سیمینار) اقبال کا فلسفہ نیشنل لینگو یج اتھارٹی اسلام آباد، ۱۸ اگست ۲۰۰۹ء

۱۷۔ "Iqbal and Modernity"یوم اقبال (سیمینار) مینجمنٹ سائنسز یونیورسٹی لاہور ۵ نومبر ۲۰۰۸ء

۱۸۔ Role of National language in the development of nationhood"دوروزہ انٹرنیشنل کانفرنس، (شعبہ اردو) شاہ الطیف بھٹائی نونیوسٹی خیر پور، اکتوبر ۲۰۰۸ء

۱۹۔ "Ahmad Nadeem Qasmi: A multidimensional Poet" احمد ندیم قاسمی، لٹریری کانفرنس اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۱۶ جولائی ۲۰۰۸ء

۲۰۔ Impact of the War of Independence on Urdu language and Literature.دوروزہ انٹرنیشنل کانفرنس، شعبہ ہسٹری، یونیورسٹی آف سرگودھا فروری ۲۰۰۸ء

۲۱۔ History of Urdu Literature and language with reference to British Orientalists. دوروزہ انٹرنیشنل کانفرنس سمپوزیم زبان و ادب، فیکلٹی ادبیات، استمبول یونیورسٹی ترکی، نومبر ۲۰۰۷ء

۲۲۔ "Josh: A great poet of Urdu" جوش نیشنل لٹریری کانفرنس، اکادمی ادبیات اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۷ء

۲۳۔ Culture Islam and Iqbal: In the modern age.دوروزہ انٹرنیشنل اقبال کانفرنس، علامہ اقبال اوپن یونیوسٹی اسلام آباد، اکتوبر ۲۰۰۷ء

۲۴۔ Faiz Ahmad Faiz and his Art of poetry. فیض احمد فیض، نیشنل لٹریری کانفرنس اکادمی ادبیات اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۷ء

۲۵۔ "Iqbal's Utopia" انٹرنیشنل اقبال سیمینار، بنکاک تھائی لینڈ، اکتوبر ۱۹۹۹ء

ان عنوانات کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ نجیبہ عارف نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے تاہم زیادہ تر مقالات اقبال کے حوالے سے ہیں ان مقالات سے ظاہر ہوتا ہے نجیبہ عارف علامہ اقبال کے کلام اور فکری نظریات میں خاصی دلچسپی رکھتی ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ایم۔فل کا مقالہ بھی اقبالیات پر ہے ان کے مقالات جن میں اقبال کا تصور عورت، اقبال کا تصور تاریخ، اقبال کا تصور یوٹوپیا، جدید دور میں اقبال اور اسلام، اقبال اور جدیدیت، اقبال اور تہذیبوں کا تصادم وغیرہ شامل ہیں ان مقالات کو دیکھا جائے تو یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر کے حوالے سے ان کا مطالعہ وسیع ہے ان کا ایک مقالہ دور جدید کی تہذیبی ساخت اور اسلام فکر اقبال کی روشنی میں' ہے۔ اس میں جس انداز سے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے جدید دور کی تہذیبی ساخت اور اسلام کو اقبال کی فکر کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر پر ان کی گرفت مضبوط ہے اسلام کے حوالے سے اقبال کا تصور تھا کہ دین میں جبر نہیں ہے اور جدید تہذیب کی جڑیں جس مغربی تہذیب کے اندر پیوست ہیں اقبال اس کے کم وبیش سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور اقبال نے آج سے ستر اسی برس پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب کا جس طرف رجحان ہے اگر اسے بروقت نہ روکا گیا تو بالآخر اس کا انجام تباہی ہوگا اقبال کے ہاں ہمیں مغربی تہذیب پر تنقید کے ساتھ ساتھ مثبت پہلو بھی نظر آتے ہیں جنھیں اقبال نے سراہا بھی ہے مثال کے طور پر اقبال عقل اور سائنس کی ترقی کے بھی مداح رہے اور یورپ کی علمی ترقی سے بھی متاثر تھے مثلاً ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق

> اقبال سمجھتے تھے کہ اگر مغربی تہذیب کو مادیت کے چنگل سے نجات نہ ملی تو اس کی علمی وفکری ترقی بھی اس کے لیے ایک جال بن جائے گی تمدنی روایات اور فنون کے معاملے میں بھی اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے طرز عمل سے اختلاف ملتا ہے۔(۱۲)

نجیبہ عارف نے اس مضمون میں تہذیب، روح، آزادی کا نظریہ ان سوالات نے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی ہیں ان کا نکتہ نظر واضح طور پر سامنے آیا ہے یہی ایک نقاد، محقق اور لکھاری کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری پر اپنی تحریر کا اس انداز سے اثر چھوڑتا ہے کہ قاری پڑھ کر سمجھ جائے جس طرح انھوں نے دین واسلام کے بارے میں یہ کہا ہے کہ دین فطرت ہے اسے خودکش دھماکوں حملوں سے نافذ نہیں کیا جا

سکتا اور انسانی فطرت یہ ہے کہ اسے اس کی روح کے اندر سے ابھر کر سامنے آنا چاہیے، اقبال کے علاوہ بھی ان کے ہاں تحقیق وتنقیدی موضوعات کے ساتھ ساتھ شعری ادب سے دلچسپی بھی ان کے ذوق کا پتا دیتی ہے انھوں نے دوسرے شاعروں کے حوالے سے بھی مضامین لکھے ہیں اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کا شاعری سے لگاؤ اور مطالعہ جوان کے ین شاعرہ ہونے کا ثبوت ہے۔ ن۔م راشد اردو شاعری میں ایک بہت بڑا نام ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ن۔م۔ راشد کی شاعری کے ارتقائی مراحل کے نام سے مقالہ لکھا جس میں ن۔م۔ راشد کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے مجموعہ کلام پر بھی بہت خوب صورتی سے بات کی اور مثالوں کے ساتھ ان کی شاعری کو بیان کیا جس طرح نجیبہ عارف نے راشد کے ہاں اضطراب مسلسل، ایک بےبسی و بے چارگی، ایک بے یقینی، ایک ناامیدی بیان کی ہے وہ اس کیفیت کو بیان کرنے میں کامیاب بھی ہوئی ہیں نجیبہ عارف نے ن۔م۔ راشد کی ذہنی کیفیت کا معنی خیز استعارہ ان کی آخری نظم ''خودکشی'' سے لیا ہے۔

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں

چاٹ کے دیوار کو نوک زبان سے ناتواں

صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی!(۱۳)

اسی طرح انھوں نے ''فیض کی مقبولیت کے اسباب'' نے نام سے بھی مقالہ لکھا فیض احمد فیض جیسے شاعر کو کون نہیں جانتا فیض کے ہاں ہمیں ایک گہرا کرب اور ایک دل لگی سے ملتی ہے ان کے فکر وخیال میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے جو انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے نجیبہ عارف کے مطابق: فیض احمد فیض کے ہاں ہمیں ایک طلسمی فضا نظر آتی ہے ایک فنکار کا کمال یہ ہے کہ لرزش سنسنی ایک عارضی ہیجانی کیفیت ثابت نہ ہو بلکہ اسکے الفاظ میں ایسی گرفت ہو کہ دور تک اور دیر تک مئوثر رہے(۱۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ہاں ہمیں جتنے مقالے، مضامین، تحقیقی وتنقیدی کتب اور ان کی اپنی تخلیقات نظر آتی ہیں ان میں الفاظ کی خوب صورتی کا چناؤ جملوں کی براجستگی اور جس طرح وہ تفصیل سے لکھتی ہیں وہ کسی اچھے ادیب اور ایک ایسے مصنف، محقق ونقاد کی پہچان کا خاصہ ہیں جو صاحب علم اور دانش ور ہوتا ہے اور جس کا مطالعہ اس قدر وسیع

ہوتا ہے کہ قاری کہیں بھی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ شاعروں کے ساتھ ان کے روابط اور ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات ان کے وسیع مطالعے کی دلیل ہیں ''منیر نیازی کی طلسمی کائنات شعر'' بہت خوب صورتی سے انھوں نے مقالہ لکھا ہے جس میں منیر نیازی کے ایک مٹتے ہوئے اور تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے عہد کے احساس الم اور کربناک تحیر کی داستان بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں ان کے ہاں زندگی کے سیاسی، معاشرتی اور فکری مسائل کو جوں کا توں بیان کرنے کا رویہ نہیں ملتا۔۔۔۔۔منیر نیازی کا سیاسی وسماجی شعور کبھی درد و کرب کی لے میں کو کبھی بغاوت و سرکشی کے نعرۂ مستانہ میں ظہور کرتا۔

نجیبہ عارف کے ہاں زیادہ تر ہمیں شاعری کے حوالے سے جو مقالے، مضامین ملتے ہیں ان شاعروں میں ''افتخار عارف بیسویں صدی کی تنہائی کا شاعر'' افتخار عارف کے ہاں مسلسل عصری کشمکش اور کرب کا اظہار ملتا ہے جو یقین و بے یقینی کے درمیان ٹھوکریں کھاتی مخلوق کا مقدر ہے ان الفاظ اور جملوں کو دیکھتے ہوئے پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اہل علم اور ایک ایسے ادیب کی تحریر ہے جو لکھنے کا فن جانتا ہے اور اپنے قاری کو محظوظ کرنے کے ہر طریقے سے بخوبی آگاہ ہے ان کے علاوہ ''انور مسعود ایک فیض یافتہ شاعر'' مقالہ ہے نجیبہ عارف انور مسعود کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ انور مسعود کی شاعری تہذیبی شکست کا نوحہ ہے مٹ جانے والی اچھی قدریں جذبوں کے سرد ہوئے لاؤ اور تہذیبوں کے تصادم میں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ ریزہ ریزہ ہوئی عوامی زندگی کی مثبت قدریں دو کشتیوں میں سوار جدید انسان کی ذہنی کشمکش اور اس کے خود تلاش کردہ رنج والم جو آنکھوں کو بنجر اور دل کو پتھر کر دیتے ہیں انور مسعود کا مسلسل موضوع ہیں'' احسان اکبری کا شعری شغف، ''انعام الحق جاوید کی عصری نسبت'' محمد اظہار الحق کی شاعری '' پانی پہ بچھا تخت کے حوالے سے'' پروین طاہر کی نظمیں ،''حمیدہ شاہین کی شاعری''۔۔۔۔۔''دستک'' سے ''دشت وجود'' تک ان کے علاوہ انھوں نے جوش کے حوالے سے بھی مقالات پڑھے ہیں ان کے ہاں ہمیں تحقیق وتنقیدی مقالات میں نثری ادب کا رجحان بھی ملتا ہے جس میں ممتاز مفتی کا افسانوی ادب۔۔۔۔۔''معاصر ادبی رجحانات کے تناظر میں'' ممتاز مفتی کے بارے میں ڈاکٹر صاحبہ کے ہاں ہمیں زیادہ دلچسپی نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ممتاز مفتی کو بہت قریب سے جانتی ہیں ان کے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی ''ممتاز مفتی کے فکری ارتقاء'' پر ہے جس میں انھوں نے ممتاز مفتی کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس

مقالے میں ممتاز مفتی کے افسانوی ادب کے بارے میں بات کی ہے۔ان کے مطابق ممتاز مفتی نے ان عام لوگوں کی بات کی ہے جو زندگی کے وسیع وعریض میدان میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں وہ محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی ان کے افسانوں میں جنس محض ایک جسمانی احتیاج کی صورت اختیار نہیں کرتی بلکہ ایک برتر انسان کی مجموعی شخصیت کا اشاریہ قرار پاتی ہیں اس مقالے میں ڈاکٹر صاحبہ ممتاز مفتی اور منٹو کا تقابل کرتے بھی کہتی ہیں کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کریہہ صورتیں ہیں بھٹکی ہوئے زندگی ،صراط مستقیم سے منحرف زندگی ، نظام سے باغی زندگی ،غلیظ نالیوں میں رینگتی ہوئی زندگی ،کھولیوں کے تاریک گوشوں اور غلاظت کے ڈھیروں میں ہلتی ہوئی زندگی ملتی ہے جبکہ ممتاز مفتی نے انسانی نفسیات کے زیادہ پیچیدہ راستوں کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے ان کے کردار ا کہرے اور سادہ نہیں ان کے ہاں جنسی جذبہ خارجی دباؤ کے باعث دب جاتا ہے اور یہ ممتاز مفتی کے ابتدائی دور کے افسانوں کا مقبول ترین موضوع ہے۔

ان کا ایک مقالہ ''مشتاق احمد یوسفی'' کی آب گم پر ہے اس کتاب کے بارے میں انھوں نے بہت خوب صورت بات لکھی ہے کہ جب بھی ''آب گم'' پڑھی میں میں نہ رہا،تم تم نہ رہے والے کی کیفیت ہوگئی اس کے علاوہ انھوں نے سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر ''عطاالحق قاسمی کی کالم نگاری''،''تشخص کا طالب اجمل نیازی'' حمید شاہد کی افسانہ نگاری ''مرگ زار'' کے حوالے سے فاطمہ حسن کی ''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' اور وحید احمد کا ''زینو''۔۔۔ایک جائزہ ان کے بارے میں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے وہ ہر طرح کی تحریروں پر لکھنے کی قدرت رکھتی ہیں اور ان کے بارے میں اپنے تجزیہ دیتی ہیں ان کا ایک مقالہ ''بین الاقوامی سطح پر یہ صرف ایک معاشرتی نظریہ ہی نہیں بلکہ سیاسی تحریک بھی ہے نجیبہ عارف نے یہ مقالہ لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق سے بھی بے خبر نہیں ہیں جن جن عورتوں نے برصغیر میں عورت کے مسائل اور معاشرے میں عورت کے مروجہ کردار اور مقام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ان میں رضیہ سجاد ظہیر،عصمت چغتائی،ممتاز شیریں،قراۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور'' شامل ہیں نجیبہ عارف کے مطابق ان میں سے اکثر کو معاشرتی اور ادبی دونوں محاذوں پر خاصی کڑی تنقید اور مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا اور آزادی نسواں کے حوالے سے ان کی جدوجہد کو مذہب وسماج کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف گردانا گیا۔

ان مقالات کو پڑھ کر ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے ہاں ہمیں کس طرح کے

موضوعات ملتے ہیں ان تمام مقالات اور نجیبہ عارف کی ادبی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے اگلے ابواب میں ان کی مختلف جہات کو سامنے رکھا جائے گا مثال کے طور پر بطور افسانہ نگار، شاعرہ، مترجم، مدیر، نقاد اور محقق۔ اس تحقیقی مقالے کے ذریعے ان کی مختلف ادبی جہات اور تنقیدی نقطہ نگاہ کو سمجھنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نجیبہ عارف (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۳ فروری ۲۰۱۶ء بوقت گیارہ بجے

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ نجیبہ عارف (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۳ فروری ۲۰۱۶ء بوقت گیارہ بجے

۵۔ ایضاً

۶۔ حمیدہ شاہین انٹرویو از نادیہ حفیظ بذریعہ فون کال ۹ ستمبر ۲۰۱۶ء بوقت شام ۴ بجے

۷۔ شیراز فضل (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۲۶ اپریل ۲۰۱۶ء بوقت دس بجے

۸۔ حمیرا اشفاق (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۲۴ اپریل ۲۰۱۶ء بوقت ایک بجے

۹۔ نجیبہ عارف (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۳ فروری ۲۰۱۶ء بوقت گیارہ بجے

۱۰۔ نجیبہ عارف (انٹرویو) از نادیہ حفیظ بمقام انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی ۳ فروری ۲۰۱۶ء بوقت گیارہ بجے

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، (دور جدید کی تہذیبی ساخت اور اسلام فکر اقبال کی روشنی میں) پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۱۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، (ن،م راشد کی شاعری کے ارتقائی مراحل) پورب اکادمی اسلام آباد ، ۲۰۰۸ء، ص ۶۱

۱۴۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رفتہ و آئندہ، (فیض احمد فیض کی مقبولیت کے اسباب) پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۹۴

باب دوم

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحیثیت نقاد

اردو ادب میں تنقید: پس منظری مطالعہ

عربی اور فارسی کی کتابوں میں تنقید کے لیے چند اور الفاظ بھی ملتے ہیں مثلاً محاکمہ، موازنہ اور تفریط وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ادب میں کسی فن بارے کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نقاد بتاتا ہے کہ وہ فن پارہ کیسا ہے تو اسے تنقید کہتے ہیں۔ چونکہ ادب ادیب کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اسی لیے ادب پارے کو سمجھنے کے لیے ادیب کی شخصیت کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ ادیب اور اس کا ادب پارہ کسی خاص ماحول، کسی خاص معاشرے میں جنم لیتا ہے اور یقینی طور پر ان عوامل سے متاثر ہوتا ہے اسی لیے ادیب اور ادب کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس خاص ماحول، خاص دور اور معاشرے کے سیاسی حالات، معاشی نظام اور اس وقت کے رجحانات کو بھی دیکھا جائے تاکہ ادیب کے ذہن تک پہنچا جا سکے اور ادب پارے کو بخوبی سمجھا جا سکے ایک تنقید نگار کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ جس چیز پر تنقید کر رہا ہے اس کی حقیقت اور اہمیت کا کوئی بھی گوشہ نظر انداز نہ کرے کیونکہ یہ ایسا فن ہے جو تخلیق کاروں کی ہر اعتبار سے رہنمائی کرتا ہے ایک تنقید نگار کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ دیانتدارانہ تقاضوں کے تحت کسی بھی تحریر کی اس طرح چھان بین کرے کہ اس میں کسی بھی قسم کی کوئی غلطی کا شک وشبہ نہ رہ جائے۔ ادب زندگی کا ایک نمایاں اور اہم شبہ ہے اس لیے ادبی تخلیقات کی بہتر تفہیم کے لیے تنقید کا وجود میں آنا لازمی ہے اس کی مدد سے ادب کو بہتر طور سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ''ٹی۔ ایس، ایلیٹ کی یہ بات اس ضمن میں بالکل درست ثابت ہوتی ہے کہ تنقید ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگریز ہے جتنا کہ ہمارے لیے سانس لینا'' (۱)

تخلیقات میں بہتری لانے اور ان کو مکمل اور جامع بنانے کے لیے تنقید سے مدد ملتی ہے تحقیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ہر شعبہ زندگی کی طرح تنقید کا اطلاق ادب اور فن پر بھی ہوتا ہے کیونکہ ادب اور فن بھی زندگی کے درمیان رہ کر پیش کیے جاتے ہیں اور یہ زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں ادب میں تنقید اپنا کام فن

کار کے تخلیقی عمل سے ہی شروع کر دیتی ہے اور سب سے پہلے ایک فن کار زندگی کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے اور پھر کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ عبادت بریلوی اپنی کتاب میں اسکاٹ جیمز کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔''یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس وقت تک تنقید نہیں کر سکتے جب تک فن کا وجود نہ ہو لیکن یہ خیال اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتا کہ فن کی عمارت تنقید پر ہی کھڑی کی جاتی ہے۔''(۲)

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب تنقیدی دبستان میں دبستان کے کئی شعبے بیان کیے ہیں جن میں نظری تنقید اور عملی تنقید دو بڑے شعبے ہیں نظری تنقید جس میں نظریاتی تنقیدی، مسائل ومباحث کا جائزہ لیتے ہوئے تخلیق کا جائزہ کیا جاتا ہے تشریحی تنقید اس کے ذریعے کسی بھی ادب پاروں کو تحسین کے اصولوں سے روشناس کرایا جاتا ہے اور تمدنی تنقید میں ثقافت اور تہذیب اور اس کے تشکیلی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔ عملی تنقید اس تنقید کی مدد سے نقاد فن پاروں کا مطالعہ کر کے فیصلہ صادر کرتا ہے۔(۳) ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے الفاظ میں نظری تنقید اور عملی تنقید کی وضاحت اس طرح کی ہے۔ نظری تنقید تحلیقی عمل کی کارکردگی کا احاطہ کرتی ہے اور تنقید کی غایت کا دائرہ کار اور دیگر عملی شعبوں سے اس کے رابطوں کو ہی موضوع نہیں بناتی بلکہ تخلیق کاری میں شامل تینوں کرداروں یعنی مصنف، فن اور قاری کار کردگی اور اہمیت پر بھی گفتگو کرتی ہے اور عملی تنقید تنقید کے ایک تنقیدی مکتب کے تحت یا مختلف تنقیدی زاویوں کے امتزاج کو بروئے کار لا کر تخلیق کے عقبی دیار کا احساس دلاتی ہے تخلیق کو کھول کر اس کے اجزائے ترکیبی کو بے نقاب کرتی اور اس کے بارے میں فیصلہ سناتی ہے عملی تنقید کا مظاہرہ کرنے والے نقاد کی اصل خوبی اس بات میں ہے کہ وہ قاری کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ اس نے اپنے تنقیدی عمل میں کن اوزاروں کو برتا ہے۔(۴)

موجودہ دور میں تنقید کی اہمیت بڑھ گئی ہے تنقید نہ صرف دو شعبوں نظری اور عملی میں تقسیم ہے بلکہ نقد و نظر کے کئی طریقے رائج ہو چکے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب تنقیدی دبستان میں تنقید کے کئی دبستان بیان کیے ہیں اور تنقید کی اقسام کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے تنقید کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔ مارکسی تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، تقابلی تنقید، عمرانی تنقید

مختلف ماہرین علم وفن نے تنقید کی تعریف مختلف انداز میں اس طرح کی ہے۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی لکھتے ہیں۔ تنقید کے لغوی معنی پرکھنے یا برے بھلے کا فرق معلوم کرنے کے ہیں اصطلاح میں محاسن ومصائب کا صحیح اندازہ کرنا اور اس

پر کوئی رائے قائم کرنا تنقید کہلاتا ہے۔(۵)

اردو میں جب ہم تنقیدی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے زمانے میں نشر و اشاعت کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے ان کی تلافی مشاعروں کے ذریعے ہی ہوتی تھی اردو میں تنقید کا آغاز ۱۹ویں صدی کے آخر میں ہوا اور تنقید کے ابتدائی خدوخال زیادہ تر فارسی زبان میں نظر آتے ہیں جن میں سے بیش تر فارسی زبان میں ملتے ہیں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں کے علاوہ قدیم کتب کے متون یا دیباچوں میں یا مشاعروں میں شعرا کو ملنے والی ''داد'' کی صورت میں ملتے ہیں جو ایک شاعر ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے اگر ان کو کوئی شعر اچھا لگتا تو ان پر داد دیتے تھے اور اس کے برعکس چپ رہتے تھے۔یہی ''چپ'' ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہے لہذا یہ کہنا کہ مشاعرے میں کی جانے والی تحسین تنقید نہیں درست نہیں ہے۔فراق گورکھپوری کا کہنا ہے۔

> میں اس خیال سے بہت کم متفق ہوں کہ مشاعروں کی تعریف یا شعروشاعری کی صحبتوں کی تعریف تنقید بنیں بسا اوقات یہ تنقید بہت پتے کی ہوتی ہے اور کئی موقعوں پر خطوط یا تذکروں یا عام بات چیت میں ضمنی طور پر شعروادب کے بارے میں جو باتیں قلم یا زبان سی اضطراری حالت میں نکل جاتی۔ ہیں وہ ہر بہ ہدف ہوتی ہیں۔(۶)

اردو تنقید کے ارتقا کی ایک کڑی وہ تفریظات ہیں جو مختلف کتابوں پر لکھی جاتی ہیں ان کی تنقیدی حیثیت بہت کم ہے اس لیے کہ ان میں صرف تعریف و تحسین ہی ہوتی تھی اس طرح دیباچے اور مقدمہ نگاری سے بھی تنقید کے ارتقا کا پتا چلتا ہے۔تنقید کے سلسلے میں تذکرہ نویسی کا شمار ایک اہم کڑی کے طور پر ہوتا ہے اردو کے اہم تذکروں میں نکات الشعر (میر تقی میر) مخزن نکات (قیام الدین قائم) چمنستان شعراء (بچھمی نرائن شفیق) تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) تذکرہ ہندی گویاں (غلام ہمدانی مصحفی) مجموعہ نثر (قدرت اللہ قاسم) گلشن بے خار (مصطفٰی خان شیفتہ) اس کے علاوہ گلشن ہند (از میرازعلی لطف) خوش معرکہ زیبا (سعادت خان ناصر) انتخاب داواوین (امام بخش صہبانی) قطعہ منتخب (عبدالغفور نساخ) انتخاب یادگار (میر احمد مینائی) آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد) قابل ذکر ہیں(۷)

ڈاکٹر شارب ردولوی اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کسی بھی تذکرے کو تنقید کا درجہ نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس عہد کی تنقید کا ہلکا سا خاکہ ان میں نظر آتا ہے۔۔۔۔ ہمارے لیے ان کی ایک خاص تاریخی ادبی اور تنقیدی اہمیت ہے جس کی بنیاد پر ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں'' (۸)

اردو ادب پر ۱۸۵۷ء کے واقعات نے بڑا گہرا اثر ڈالا اس سے پہلے تنقید کسی واضح اور مربوط شکل میں موجود نہیں تھی اس واقعہ کے بعد تنقید نے ادب کی لغوی خوبیوں کے طرف توجہ مبذول کروائی ظاہری حسن کی بجائے خیال اور موضوع کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی اور ادب کا مقصد سماجی اصلاح ٹھہرا اور ایک خاص نقطہ نظر سے اسے خوش گوار تبدیلی کا نام دیا جا سکتا ہے اور اسی تبدیلی کے اثرات ادب پر بھی رونما ہوئے اور اس قسم کے خیالات کی ابتداء محمد حسین آزاد نے اصلاحی انجمن کی بنیاد رکھی پنجاب میں محافل مناظمہ کی طرح ڈالی گئی اور جس میں مغربی طرز پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں اسی وجہ سے محمد حسین آزاد کو محفل مناظمہ کا بانی کہا جاتا ہے۔ حالی نے بھی آزاد کی پیروی کی اور جدید شاعری کی طرح ڈالی۔

تاریخی اعتبار سے محمد حسین آزاد اس سلسلے کے پہلے باضابطہ نقاد ہیں جنھوں نے ۱۸۶۷ء کو انجمن پنجاب کے ایک مشاعرے میں اپنے لیکچر نظم اور کلام موزوں کے باب اپنے تنقیدی خیالات کو پیش کیا۔ دیوان ذوق اور سخندان فارس میں بھی آزاد کے تنقیدی نظریات ملتے ہیں آب حیات کو تذکروں کی ارتقائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے ڈاکٹر احسن فاروقی اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''چند مخصوص صفات میں آب حیات تذکروں سے آگے بڑھ کے تاریخ اور ادب کے دائرے میں آتی ہے اس میں سے کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جو تمام تذکروں میں نہیں ملتی اور تاریخوں کا طرہ امتیاز ہیں''(۹)

آب حیات سے ہوتے ہوئے اردو تنقید ایک بہت اہم سنگ میل پر پہنچتی ہے جسے مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے جانا جاتا ہے حالی کا یہ مقدمہ شعر و شاعری کے غزلیات ہی دیوان کا مقدمہ نہیں اردو تنقید کا مقدمہ بھی ہے'' اس کی حیثیت تنقید کی پہلی کتاب کی سی ہے اس لیے اسے بہت اہمیت حاصل ہے'' (۱۰) مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے شاعری کی اصلاح پر زور دیا ہے حالی نے شعر کے لیے سادگی، موضوع، مواد، اصلیت کو ضروری قرار دیا ہے۔ حالی کی تنقید مشرق و مغرب کے نظریات کا امتزاج ہے حالی نے مغرب سے مرغوبیت کی وجہ سے مغربی نظریات کو زیادہ

اہمیت دی بہت سے نقائص کے باوجود بھی ان کی حیثیت اردو تنقید میں امتیازی وصف کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد جیسا سخت گیر نقاد بھی حالی کی تنقید پر اعتراضات کرنے کے بعد یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اردو تنقید میں آج تک نہیں لکھی جا سکی (۱۱)

حالی کے ہاں زیادہ تر تنقید عملی تنقید کے حوالے سے نظر آتی ہے حالی کے بعد شبلی نعمانی کا نام آتا ہے یہ پہلے نقاد ہیں جن کے ہاں نظریاتی تنقید نظر آتی ہے حالی کی طرح ان کا جھکاؤ مغرب کی طرف نہیں بلکہ مشرق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں شبلی پر علی گڑھ تحریک کے زیادہ اثرات نظر آئے ہیں ان کا تنقیدی سرمایہ شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر اور مقالات شبلی کی دوسری اور چوتھی جلد کے بعض حصوں پر مشتمل ہے شبلی نے اگرچہ مشرقی انداز اور مزاج اپنایا تھا لیکن وہ مغربی افکار و نظریات کے حامی بھی ہیں حالی کی طرح شبلی بھی سادگی، اصلیت اور افادیت کے قائل ہیں شبلی شاعری میں جذبات کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں ڈاکٹر عبداللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔اردو تنقید میں شبلی کا رویہ خاص آج تک اہل نقد و نظر کے لیے جاذب توجہ بھی ہے اور موجب بصیرت بھی شبلی کم و بیش پچاس برس سے ملک کی ذوقی زندگی میں رہنمائی کر رہے ہیں اور ان کی کتاب شعر العجم آج بھی زندہ و تابندہ ہے" (۱۲)

اردو میں حالی آزاد اور شبلی کی کوششوں سے تنقید کی طرف توجہ اور دلچسپی کا رجحان تیزی سے فروغ پانے لگا تھا علم و ادب سے دلچسپی لینے والوں نے اس طرف خصوصی طور پر توجہ دی اس سلسلے میں وحید الدین سلیم، امداد امام اثر اور مہدی الافادی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ وحید الدین سلیم نے باقاعدہ طور پر تنقید کی کوئی کتاب نہیں لکھی ان کے چند تنقیدی مضامین افادات سلیم نے نام سے ملتے ہیں انہوں نے سرسید تحریک نے زیر اثر سائنٹیفک انداز اختیار کیا اس کے بعد امداد امام اثر کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ان کی کتاب "کاشف الحقائق" سے پتا چلتا ہے اس میں عملی تنقیدی زیادہ ہے وہ شاعری کو قومی روایات کا علمبردار سمجھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ نصیحتوں کو غزل کے لیے غیر موزوں اور غیر مناسب سمجھتے ہیں

مہدی الافادی نے اپنے زمانے کے تنقیدی رجحانات سے اثر لیا وہ شبلی سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی طبیعت کا رجحان بھی جمالیات کی طرف زیادہ ہے ان کے ہاں انتہا پسندی بھی نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ بعض واوقات وہ

موضوع سے بھی بہت دور نکل جاتے ہیں ان کے مضامین افادات مہدی کے نام سے ملتے ہیں۔ آزاد اور مولانا حالی کی تنقید سے روشنی لینے اور ان کی پیروی کرنے والوں میں مولوی عبدالحق کا نام بہت نمایاں ہے مولوی عبدالحق مشرقی اور مغربی طور طریقوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

حالی نے بعد ایسے نقاد آئے ہیں جنہیں تاثراتی ، جمالیاتی یا روحانی نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے ابتدائی نقادوں میں شبلی کا رجحان جمالیات کی طرف ہے کیونکہ معانی کی بجائے الفاظ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے بعد مہدی افادی کا نام آتا ہے جنہوں نے اس انداز سے تنقید کو آگے بڑھایا ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے۔ ''مہدی افادی اپنی تنقیدی رائے کے لیے وجدان ہی کو رہنما بناتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی ذوقی کیفیت نے ایک آزاد فضا تخلیق کی اور قاری کے دل کو مسخر کر لیا'' (۱۳)

عبدالرحمان بجنوری رومانوی تنقید کا اہم نام ہیں یہ اردو نقادوں میں پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے یورپ کی زبانوں سے واقفیت حاصل کی ان کا مضمون محاسن کلام غالب اہمیت کا حامل ہے بجنوری کی وجہ شہرت ''محاسن کلام غالب'' ہے غالب پر ان کا یہ جذباتی جملہ آج بھی ان کی پہچان ہے کہ ہندوستان کی دوالہامی کتابیں ہیں مقدس وید اور دیوان غالب۔ نیاز فتح پوری کی تنقید میں جمالیاتی اور رومانوی ندازفکر نظر آتا ہے ان کی تنقیدی کاوشیں ''انتقادیات دو جلدیں'' ہیں ان کے نزدیک دنیا کے مختلف مظاہر اور حالات و واقعات کے جو اثرات انسانی قلب و ذہن قبول کرتا ہے ان کو مخصوص انداز میں پیش کر دینا شاعری ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''ہر فطری شاعر کسی نہ کسی پیغام کا حاصل ہوا کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دینے کے لیے مفید اور ضروری بھی ہو'' (۱۴)

عبدالماجد دریا آبادی کی تنقید بھی زیادہ تر جمالیاتی پہلوؤں کے متعلق ہے اپنے تاثرات کو جمالیاتی اور روحانی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اگرچہ ترقی پسند نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں ان کی ابتدائی تنقید میں جمالیاتی پہلو نمایاں نظر آتا ہے فراق گورکھپوری کو سب سے بڑا تاثراتی نقاد قرار دیا جاتا ہے ان کی تنقید کی بنیاد مغربی ادب کے گہرے مطالعے پر ہے حالی نے سرسید تحریک کے زیر اثر ادب اور زندگی کا رشتہ استوار کیا تھا جسے ہم عمرانی تنقید کا نام دے سکتے ہیں رومانیت اور حقیقت نگاری ایک لمبے عرصے تک الگ الگ سمتوں میں محو سفر رہے اور ترقی پسند تحریک کے آغاز میں یہ دونوں آپس میں مل گئے ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

کی تنقید ہے ان کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' ترقی پسند تحریک کی طرف پہلا قدم سمجھا جاتا ہے۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تنقید کا ایک اہم نام ہیں ان کی کتاب'' روشنائی'' ترقی پسند تحریک کی تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی نظریات کی بھی حامل ہے ڈاکٹر عبدالعلیم ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود فن پارے کے جمالیاتی پہلو کو بھی اہمیت دیتے ہیں احتشام حسین اس دبستان تنقید کا معتبر نام ہے یہ ایک ایسے نقاد ہیں جنہوں نے مارکسی نظریات پر سائنٹیفک تنقید کی ہے'' تنقیدی حاشیے ، ادب اور سماج ، روایات اور بغاوت ،تنقید اور عملی تنقید یہ ایسے مجموعے ہیں جن میں انھوں نے اپنے نظریات بیان کیے ہیں۔

سردار جعفری کی تنقید میں ہمیں انتہا پسندی کا عنصر ملتا ہے ممتاز حسین کے تنقیدی نظریات کے لحاظ سے احتشام حسین سے قریب ترین ظہیر کاشمیری کے ہاں بھی علی سردار جعفری کی طرح شدت اور انتہا پسندی پائی جاتی ہے آل احمد سرور کے ہاں اشتراکی نظریات نظر آتے ہیں ان کے ہاں مغربی نقادوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عبارت بریلوی کے ہاں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلو بھی نظر آتے ہیں وہ ادب اور زندگی کے گہرے تعلق کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی فنی پہلوؤں اور داخلی حسن کو بھی اہمیت دیتے ہیں اردو تنقید کا ارتقاء جدید شاعری ان کی اہم تصانیف ہیں سید وقار عظیم نے افسانوی ادب کو خصوصی میدان بنایا ہے وہ معروف معنوں میں ترقی پسند نہیں ہیں لیکن ادب اور زندگی کے رشتے سے بھر پور قائل ہیں۔ ترقی پسند تنقید کے آخری دور میں ڈاکٹر محمد حسن اور عابد حسین منٹو آتے ہیں ترقی پسندوں نے ادب کا رشتہ زندگی کے ساتھ استوار کر دیا۔

اردو کی تنقیدی تاریخ میں بعض ایسے نقاد بھی ہیں جنھوں نے انگریزی تنقیدی اصولوں سے استفادہ کیا ہے اور ان اصولوں کو من وعن اردو ادب پر ثابت کرنے کی کوشش کی ان نقادوں میں کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے نام نمایاں ہیں ان کی تنقید خامیوں کو زیادہ نمایاں کرتی ہے ترقی پسند تحریک نے صرف معاشی محرکات کو تخلیق ادب کا محرک قرار دیا اس طرح انتہا پسندیوں کے باعث اس کی بنیادیں کمزور ہونے لگیں اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک اس دور میں اس کے متوازی چلنے لگی اسی دور میں تنقید کا ایک اور نقطہ نظر نفسیاتی تنقید کی صورت میں سامنے آیا نفسیاتی تنقید میں فرائڈ، ایڈلر، ژونگ کے تنقیدی نظریات بنیادی کام دیتے ہیں اس میں ادب اور ادبی روایات کو نفسیاتی نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اردو میں نفسیاتی تنقید کے ابتدائی نمونے وحیدالدین سلیم ، اور مرزا ہادی رسوا کے

ہاں ملتے ہیں۔عبدالماجد دریا آبادی بھی اس موضوع پر لکھنے والوں میں شامل ہیں لیکن تنقید کے اس دبستان میں سب سے اہم نام میراجی کا ہے وہ ایک بھرپور نفسیاتی نقاد ہیں ان کا نظریہ ہے کہ داخلی اور خارجی فنی اصولوں کے قطع نظر ادب پر مصنف کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے''(۱۵)''مشرق ومغرب کے نغمے''اور''اس نظم میں''میراجی کی مشہور کتابیں ہیں حسن عسکری کی تنقید کے کئی رجحانات ہیں جن میں نفسیاتی پہلو بھی خاصا نمایاں ہے ریاض احمد بھی نفسیاتی تنقید کا ایک اہم نام ہے ان کی زیادہ تر توجہ نظری مباحث پر رہی ہے''ریاضتیں''''دریاب''اور''ادبی مسائل''ان کی اہم کتابیں ہیں جن میں نفسیاتی طریقہ کار ملتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں بھی خصوصاً''اردو شاعری کا مزاج،تنقید جدید اردو تنقید''اور''تخلیقی عمل''میں نفسیات سے بہت مدد لی گئی ہے سلیم احمد نے بھی ادب میں تہذیبی رویوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر بھی تنقید کے سلسلے میں خاصا کام کیا ہے ان کے ہاں ہمیں نفسیات کے عمل اطلاق کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تنقید کی حدود متعین کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد عسکری صاحب نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے نظریات دیے انھوں نے پاکستانی ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان کو ایک تہذیبی اکائی تسلیم کرتے ہوئے تہذیب کا اظہار کریں ممتاز شیریں جو ابتداء میں ترقی پسندوں کی حامی تھیں بعد میں عسکری صاحب کی ہم خیال بن گئیں۔پچھلے صفحات میں اردو تنقید کے آغاز وارتقاء کے مختلف مراحل کا مجمل انداز میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقید کے پس منظر میں کارفرما ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ ہم کئی ایک نقادوں اور تحاریک کو زیر بحث نہ لا سکے ہوں مثال کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی،خلیل الرحمان اعظمی،گوپی نارنگ،ڈاکٹر جمیل جالبی،ڈاکٹر سید عبداللہ،وقار عظیم،ڈاکٹر عبارت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی سمیت بہت سے معروف نقاد ہیں جنہوں نے تنقید ادب میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

مذکورہ بالا تفاصیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگلے صفحات میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لیں گے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحیثیت نقاد:

آج کے دور میں ایک اہم نام''ڈاکٹر نجیبہ عارف''جو کہ تحقیق وتنقید کے حوالے سے کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ان کا شمار دورِ حاضر کے اہم لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔نجیبہ عارف ایک نمایاں اور منفرد ادبی شخصیت ہیں ان کے

ادبی وفنی نظریہ وعمل کی تحسین ان کے ادبی مزاج کی تشکیل میں کارفرما عناصر سے آ گہی کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ میں نے اپنی تحقیق کا آغاز ان کی زندگی کے اسی ابتدائی اور تشکیلی دور سے کیا ہے۔انہوں نے اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ممتاز مفتی کے حوالے سے لکھا جو کتابی صورت میں الفیصل ناشران نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا تنقید کے حوالے سے ان کی اس کتاب ''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء'' کو بہت پذیرائی ملی اور یہ یہی کتاب دراصل ان کی شہرت کا سبب بنی یہ کتاب ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب نے ان کے لئے نئے دریچے کھولے اور نئے لکھنے والوں کی صف میں لا کھڑا کیا ادبی حوالے سے ان کا اہم مقام اور ادبی شہرت ان کا مقدر بنی اس کتاب میں انہوں نے ممتاز مفتی کی شخصیت کے بارے میں اوران کی فکر کے حوالے سے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔کیونکہ ممتاز مفتی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ اردو ادب سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ان کے نام سے اوران کے کام سے واقفیت نہیں رکھتا ہوگا اردو ادب میں ان کا نام ہی ان کی شہرت اور پہچان ہے۔اس کتاب کو جس طرح ڈاکٹر نجیبہ عارف نے لکھا ہے ان کی محنت اور کاوش جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

ممتاز مفتی کے بارے میں اگر کسی طالب علم کو پڑھنا ہوان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنا ہوان کو جاننا ہوتو اس کتاب میں بلا شبہ سب کچھ دستیاب ہےتو یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس کتاب میں ممتاز مفتی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فکری نفسیاتی پہلوؤں کو بھی سمونے کی بھر پور سعی کی گئی ہے۔اس مقالے کو محض اپنی باتوں سے ہی نہیں بلکہ حوالوں کے ساتھ مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ممتاز مفتی کے فکری ارتقاء کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے اس مقالے کو دوادوار میں تقسیم کیا گیا اس کی ابواب بندی بھی اسی طرح کی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے کوئی مشکل نہ ہو کیونکہ انہوں نے ترتیب کے ساتھ سب عوامل کو زیر بحث رکھا ہے تا کہ قاری کسی بھی الجھن کا شکار نہ ہو۔دیکھا جائے تو نجیبہ عارف نے اس کو لکھتے ہوئے زبان اتنی سادہ نہیں استعمال کی لیکن پڑھتے ہوئے کسی الجھن یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔جیسے وہ ایک جگہ ممتاز مفتی کے ناول کے بارے میں کہتی ہیں:

> ''ان کے ہاں ناول کا موضوع عشق ومحبت کا تجربہ ہے جو زندگی کی کلیت میں رفعت فکر وخیال پیدا کرتا ہے یہ محبت اپنے تمام تر جسمانی، روحانی اور ذہنی ونفسیاتی تناظر میں فرد کی قلب ماہیت کرتی اور اسے عدم سے عدم وجود کا راستہ دکھاتی ہوئی نظر آتی

ہے عشق جو فنا کا دوسرا نام ہے اور اپنی راکھ سے نیا جنم لینے کے مترادف ہے۔ جو
بیک وقت سیرابی کی لذت اور آسودگی بھی عطا کرتا ہے اور لاحاصلی کی ابدی تشنگی سے
بھی ہمکنار کرتا ہے(۱۶)

نجیبہ عارف نے اپنے طور پر جو بھی کہنے اور سمجھانے کی کوشش کی وہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہی ہیں
اس کی واضح طور پر مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ممتاز مفتی کے حوالے سے نجیبہ عارف لکھتی ہیں۔

''ممتاز مفتی کے پیش نظر جنسی آزادی یا بے حجابی جیسے جدید طریقوں کی مدد سے اس
مسئلہ کو حل نہیں کیا جا سکتا اگر چہ اس دور تک ان کا ذہن اس معاملے میں واضح نہیں کہ
جنسی گھٹن اور دباؤ کے اس ماحول کو کس طرح ایک صحت منداور مثبت تعمیری جذبے
میں ڈھالا جا سکتا ہے''۔(۱۷)

اس کتاب کو دو ادوار میں تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ سات ابواب بھی ترتیب دیئے ہیں پہلے دور میں ممتاز
مفتی کی زندگی کے پہلے پینتالیس برس، جو ان کی نجی زندگی ہے اس کے بارے میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے
پھر ان کی جو تخلیقی ادیب کے حوالے سے زندگی ہے اسے پہلے دور میں شامل کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ممتاز مفتی کی
فکری تشکیل، والدین کی شخصیت، گھریلو ماحول، ماحول کے اثرات، بچپن، عزیز و اقارب کا رویہ اور سماج کے حوالے
سے ان کی زندگی پر جو اثرات رونما ہوئے ہیں ان تمام عوامل پر انہوں نے گہری نگاہ ڈالی ہے۔
ممتاز مفتی کے والد کے حوالے سے نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

''ممتاز مفتی کے والد مفتی محمد حسین تصنیف و تالیف کا قدرتی رجحان رکھتے تھے گھر میں
ان کا زیادہ وقت ایک چھوٹی سی تپائی کے سامنے بیٹھ کر گزرتا جس پر ایک رجسٹر دھرا
ہوتا اور وہ اس میں کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے تھے ممتاز مفتی نے لکھا ہے کہ ان کی تحریر
کا موضوع صرف خاندان کے افراد کی پیدائش و اموات کی تواریخ اور آمدنی و
اخراجات کا حساب کتاب ہوا کرتا تھا''۔ (۱۸)

ممتاز مفتی کے والد نے چار شادیاں کی تھیں اور ممتاز مفتی ان کی پہلی بیگم صغرا بیگم سے تھے ان کے گھر کے

ماحول نے ان کی زندگی پر بھی اثرات مرتب کئے۔

ممتاز مفتی کے بارے میں یہ بات بھی پتا چلتی ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں جو تحریریں لکھی ہیں وہ ان کی اپنی زندگی کے تجربات وتاثرات ہیں جو انہوں نے اپنی کہانیوں میں بیان کیے ہیں ان ماخذ میں سب سے بڑا ماخذ خودنوشت ہے حصہ اول ''علی پور کا ایلی'' ہے اور حصہ دوم ''الکھ نگری'' ہے اور یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ علی پور کا ایلی ناول کے کم وبیش تمام بنیادی واقعات دراصل ان کے اپنے ہیں۔علی پور کے حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کہنا ہے:

> ''ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی میں مفتی محمد حسین کی سیرت وکردار کے تین پہلوؤں کو خصوصی طور پر نمایاں کیا ہے جس سے ان کی غیر معمولی دلچسپی رنگین مزاجی اور مجلس آرائی کی خصوصیت اور ان کے خیالات کی ندرت اور انوکھا پن اس کے علاوہ ان کی کنجوسی کی حد تک بڑھی ہوئی کفایت شعاری کا تذکرہ بھی انھوں نے شکایت آمیز لہجے میں کیا ہے۔''(۱۹)

اس باب میں ان کے عزیز واقارب سے مکالمے اور رسمی وغیر رسمی گفتگو سے بھی جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بھی اس باب میں شامل کی گئی ہیں۔دوسرے باب میں ممتاز مفتی کے پہلے دور کی تخلیقات اور ان کے ادبی مشاغل کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ان کی پہلی کہانی کب شائع ہوئی اور دور کون سا تھا اس کے علاوہ ابتدائی دور(۱۹۳۶ء سے ۱۹۲۵ء) تک جتنی بھی ان کی تخلیقات شائع ہوئیں شامل ہیں۔ممتاز مفتی کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''ممتاز مفتی کی فکر میں انقلابی تبدیلی ان کی زندگی کا پہلا نصف گزر جانے کے بعد رونما ہوئی اگرچہ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار ان کی زندگی کے پہلے دور میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں''۔(۲۰)

اس میں ممتاز مفتی کے پانچ افسانوی مجموعوں ''ان کہی''،''گہما گہمی''،''چپ''،''اسمارائیں'' اور ''گڑیا گھر'' کے علاوہ ان کے ڈرامے ''نظام سقہ'' مضامین کے مجموعے ''غبارے'' اور ان کی خودنوشت حصہ علی پور کا ایلی کا فکری مطالعہ شامل کیا گیا ہے۔ممتاز مفتی کی یہ سب ادبی تخلیقات ہیں اور صرف ان کے موضوعات اور فکری رویوں تک

محدود ہیں۔ڈاکٹر نجیبہ عارف نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ممتاز مفتی کی تحریروں کے براہ راست مطالعے کے بعد ان کے فکری ارتقاء کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا جائے اور سب سے اچھی بات یہ ہے اس رائے کے حق میں یا اس کے خلاف اگر کسی نقاد نے کچھ لکھا بھی ہے تو اس کا ذکر بھی حوالے کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نجیبہ عارف کو اس مقالے کے لکھنے کے دوران اس افسوس ناک حقیقت سے بھی آگاہی ہوئی جس کا ذکر انہوں نے اس مقالے کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''ممتاز مفتی کے فکر و فن کو ابھی تک اس سنجیدگی اور لگن سے تحقیق و تنقید کا موضوع نہیں بنایا گیا جو اس کا حق ہے''۔(۱۸)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے چونکہ اس مقالے کو لکھتے ہوئے تمام حوالوں کو مدنظر رکھا ہے اور مستند طریقے سے اپنی بات بتانے کی کوشش کی ہے تاکہ کسی بھی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اس حوالے سے انہوں نے نذیر احمد کی کتاب ''فکشن نگار ممتاز مفتی'' کو بھی اپنے مدنظر رکھا بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

> ''نذیر احمد اگرچہ باقاعدہ نقاد نہیں تھے مگر وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہتے تھے ممتاز مفتی کی کئی کتابوں پر انہوں نے فرداً فرداً مضامین تحریر کیے اور متذکرہ کتاب میں ان کے افسانوی ادب کا دقیق اور گہرا مطالعہ ہے۔''(۲۱)

مقالے کا تیسرا باب ممتاز مفتی کے پہلے دور کے فکری ماخذ کی بحث پر مشتمل ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ممتاز مفتی کے فکری ارتقاء کا سفر طویل بھی ہے اور پیچیدہ بھی یہ سیدھا اور صاف راستہ نہیں بلکہ اس میں کئی خم و پیچ اور نشیب و فراز نظر آتے ہیں وہ اپنی تخلیقی زندگی کے پہلے دور میں جن فکری رجحانات سے متاثر ہوئے ان میں نفسیات سرفہرست ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باب میں ممتاز مفتی کے فکری نظام کا بھی گہرا مطالعہ شامل ہے۔ممتاز مفتی کے نفسیاتی افسانے بھی فطری و فضا میں ایک نامانوس منظر پیش کرتے ہیں اور توضیحی جملوں کے بغیر بھی افسانہ نگار اپنے مطلوبہ ہدف کو باآسانی حاصل کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف ممتاز مفتی کے نفسیاتی افسانوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''دراصل ممتاز مفتی کے نفسیاتی افسانوں کے پس پشت ایک اہم اور طاقت ور محرک کارفرما ہے وہ محض خشک اور بے جان نظریوں کے مبلغ نہیں بلکہ یہ نظریات اور افکار

ان کے نزدیک تفہیم ذات کے سفر کا ایک مرحلہ ہیں''۔(۲۲)

ممتاز مفتی پر ایڈلر کے اثرات کے بارے میں کوئی سنجیدہ تحقیقی محاکمہ نہیں ملتا ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ''ممتاز مفتی کے اکلوتے بیٹے عکسی مفتی کا بھی یہی کہنا ہے کہ انھوں نے فرائیڈ، یونگ اور ایڈلر تینوں کی نفسیات سے کلیدی نکات حاصل کئے اور انھیں اپنے معاشرتی تجربات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ ممتاز مفتی کے فن پر دوستو فسکی کے اثرات ان کی جزئیات نگاری اور انسانی فطرت کے تضاد کی عکاسی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔اگلے باب میں ان کے معاصر ادب کے حوالے سے ان کے فکری رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے سب سے پہلے بیسویں صدی کے افسانوی ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔اگر دیکھا جائے تو اس وقت ہیئت کے نئے نئے تجربے ہونے لگے تھے اور اردو کی ادبی نثر ڈپٹی نذیر احمد کی قصہ گوئی، سرستار کے فسانہ، آزاد اور شرر کے تاریخی ناولوں سے ہوتی ہوئی امراؤ جان اداء کی نزاکت و لطافت سے گزر کر مختصر افسانے کی مغربی صنف تک آن پہنچی۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

> ''ممتاز مفتی کے پہلے دور کی نثر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کی فکر کا مرکزی نکتہ انسان کے باطن کا مطالعہ ہے وہ فرد کے خارج اور باطن کے درمیان رونما ہونے والے تصادم کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں اس عمل میں وہ معاشرے کے ان کمزور پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جو فرد کی نفسیاتی کجی کا سب بن جاتے ہیں اور فرد کے اندرون میں برپا ہونے والے ان داخلی طوفانوں کا تجزیہ کرنا بھی نہیں بھولتے جو معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس حوالے سے ان کے ہاں تین موضوعات تسلسل اور متواتر سے ملتے ہیں۔
>
> ۱۔ جنس
>
> ۲۔ عورت
>
> ۳۔ تہذیبی و معاشرتی رویے، (۲۳)

ممتاز مفتی کے ہاں جنس کا بیان ایک واضح اور دوٹوک مقصد کے تابع نظر آتا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔بقول ڈاکٹر اشفاق حسین:''عورت ان کی دوسری بڑی کمزوری ہے'' (۲۱) اس

اعتبار سے ممتاز مفتی کی فکر میں ایک ارتقائی تسلسل موجود ہے کیونکہ پہلے دور میں ان کی توجہ نفسیاتی حوالے سے ہے، جبکہ دوسرے دور میں وہ روح کی پرواز کے تمنائی نظر آتے ہیں۔ دوسرا دور جو اس کتاب میں شامل ہے یہ پانچویں باب سے شروع ہوتا ہے یہ باب ممتاز مفتی کے متصوفانہ رجحانات کے ارتقاء سے متعلق ہے یہ بات کسی بھی اہل علم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ممتاز مفتی کا نام تصوف کے حوالے سے بھی پہچان رکھتا ہے ممتاز مفتی کی زندگی میں تصوف سے دلچسپی کا آغاز ۱۹۵۱ء کے بعد ہی سے ہوا اس باب میں جگہ جگہ واقعات کی بھرمار ہے جس سے ان کی تصوف سے دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تصوف کا عمل دخل ان کی زندگی میں سائیں اللہ بخش اور قدرت اللہ کی رفاقت اور دوستی کی بدولت ہوا جو رفتہ رفتہ عقیدت میں بدل گیا۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''یہ ممتاز مفتی کی زندگی وہ رخ ہے جسے انھوں نے شعوری طور پر اظہار کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے انھوں نے اپنے ساتھ بیتنے والے غیر معمولی واقعات اور بزرگوں کی کرامات وغیرہ کا تو ذکر کیا لیکن اس بات کا کبھی اعتراف نہیں کیا کہ وہ بھی پورے خلوص اور سچائی سے راہ سلوک پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' (۲۴)

چھٹا باب ممتاز مفتی کی تخلیقی زندگی کے دوسرے دور کے فکری جائزے پر مشتمل ہے اور ممتاز مفتی کا یہ دور تخلیقی اعتبار سے پہلے دور کی نسبت کہیں زیادہ فعال اور مئوثر ثابت ہوا۔ اس دور میں ان کے تین افسانوی مجموعے، دو سفر نامے چار سبھی خاکوں کے مجموعے، مجموعہ مضامین ایک رپورتاژ اور ان کی طویل خودنوشت کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ ''روغنی پتلے'' سے کا بندھن'' کہی نہ جائے'' ان میں جتنے بھی افسانے شامل ہیں ان سب کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے چیدا چیدا گفتگو کی ہے۔ ممتاز مفتی کی آخری کتاب تلاش ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ یہ کتاب آپ سے باتیں کرے گی ہلکی پھلکی باتیں چھوٹے چھوٹے مضوعات پر باتیں ممکن ہے آپ کو اس کی کچھ باتوں سے اتفاق نہ ہو، ایسا ہو تو ازراہِ کرم اس کی بات کو پلے نہ باندھیں جھگڑا نہ کریں صاحبو دلیلوں سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ اختلاف رائے تو ہوتا ہی ہے۔ اسی سے تو زندگی رنگ بھری ہے۔ وہ خود ہی اس کتاب کا مخاطب نوجوان نسل کو قرار دیتے ہیں جوان کے خیال میں بہت مظلوم ہے کیونکہ نوجوان نسل کو بڑے مناسب اہمیت نہیں دیتے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

> ''تلاش پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا بنیادی مقصد انسانیت کو قرآن مجید کی عظمت اور انفرادیت کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ تا کہ وہ اس الہامی دانش کے ذخائر سے رجوع کر سکے جو دینی و دنیاوی تمام امور کے لئے رہنمائی کا ذریعہ ہے''۔(۲۵)

آخری باب میں ادب اور معاشرے پر اثرات کے بارے میں بتایا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ ماخذات، انگریزی کتب، مقالات و مضامین، مسودات و قلمی نسخے مقالے انٹرویوز کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ ممتاز مفتی کی تحریروں کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کی نئی پود کو جو مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید میں دیوانہ وار بھاگ رہی ہے، دوستانہ انداز میں روک کر، ان کے لہجے میں باتیں کر کے، ان کا اعتماد حاصل کر کے یہ سمجھایا جائے کہ بقا کا راز تقلید میں نہیں بلکہ اسلامی شناخت کے احیاء میں ہے۔ اردو نثر اور ادب کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقاء اور پاکستانی افسانوی ادب پر تصوف کے اثرات اس میں جو ادیب شامل ہیں سب کا بخوبی ذکر کر کے نجیبہ عارف نے اپنی لگن اور محنت کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ ایک قاری کی یہی پہچان ہوتی ہے یہی انداز بیان ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے قاری کو متاثر کرتا ہے۔

نجیبہ عارف کی دوسری کتاب تنقید کے حوالے سے اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب ۹/۱۱ اور اردو افسانہ ہے۔ یہ انتخاب و تجزیہ کی کتاب ہے جس میں ۹/۱۱ کے بعد جو بھی افسانے لکھے گئے ان سب کو انہوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے نجیبہ عارف نے اردو فکشن میں گیارہ ستمبر کے اثرات کا جس قدر انہماک اور توجہ کے ساتھ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ عملی تنقید میں اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی یہ کتاب ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب پورب اکادمی اسلام آباد سے مئی ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کا پیش لفظ سید مظہر جمیل نے لکھا ہے۔ تنقید کے حوالے سے ان کا کہنا ہے:

> ''ادبی تنقید کا بنیادی وظیفہ تو یہی ہے کہ وہ تخلیقی فن پاروں کی معنوی جہات کی نشان دہی کرے اور ان میں چھپے ہوئے معنیاتی امکانات کی موجودگی (یا عدم موجودگی) کے تجزیاتی مطالعے سے فن پارے کے متن میں پنہاں احساس جمال اور منوں کاری حیات کے اسرار و رموز کو جس حد تک بھی ممکن ہو سکے منکشف کرے''۔(۲۴)

اس کتاب میں منتخب افسانوں کے حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے اور ۲۲ افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ اسے ۹/۱۱ (گیارہ ستمبر) کا نام دیا گیا اس لئے کے یہ واقعہ اکیسویں صدی کے پہلے برس (۲۰۰۱ء) گیارہ ستمبر نیویارک میں وقوع پذیر ہوا جس میں دو عظیم اور بلند عمارتوں کو دہشت گردوں نے منہدم کر کے عالمی نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ نجیبہ عارف نے اردو فکشن میں گیارہ ستمبر کے اثرات کا جس انہماک اور توجہ سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ معاصر عملی تنقید میں تازہ کارانہ فعالیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

۹/۱۱ کے اثرات امریکہ کے علاوہ دوسرے ممالک پر بھی اثر انداز ہوئے اور لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز سے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا بلا شبہ اگر دیکھا جائے تو گیارہ ستمبر کا دن ایک نیا پیغام چھوڑ گیا ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا اس واقعے کا امریکہ کے ساتھ ساتھ جن ممالک پر سب سے زیادہ اثر ہوا ان میں ابھی تک عراق، افغانستان اور پاکستان کے نام شامل ہیں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستان بہر طور پہلے ہی دن سے اس کا حصہ یا نشانہ بن رہا ہے اگر دیکھا جائے تو مغرب میں اس کے حوالے سے بالخصوص امریکہ میں اس موضوع پر خاصی تحقیق ہو چکی ہے اور گیارہ ستمبر کے اثرات کا ادبی لسانی عمرانی سیاسی اور تاریخی نقطہء نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے تناظر میں ہی کئی ناول نظمیں اور دستاویزی فلمیں بنیں موسیقی، مصوری کے ذریعے اسے دیکھنے اور سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئی اور انسانی زندگی پر اس واقعے نے جو گہرے اثرات چھوڑے ان کا تجزیہ کیا گیا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے چند مختصر ناولوں کا بھی تذکرہ کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جس سرزمین پر یہ وقعہ ہوا اس پر بسنے والے لوگوں نے خود اسے کس نظر سے دیکھا اور محسوس کیا۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف ''عام طور پر انگریزی فکشن نے گیارہ ستمبر کے اثرات کو اسی سطح پر دیکھا اور محسوس کیا ہے''۔(۲۶)

نجیبہ عارف نے اس کتاب میں انہوں نے کین کیفلس (KenKalfus) کے ناول (A Disorder Peculiar to the country) کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ کہ کس طرح طلاق پر آمادہ ایک شادی شدہ جوڑے کی باہمی نفرت اور عداوت کو گیارہ ستمبر کے پس منظر میں بیان اور اجاگر کیا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نجیبہ عارف نے جن ناولوں کا مختصر ذکر کیا ہے ان کو بھی حوالوں کے ساتھ ان کو مستند بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایک اور ایوارڈ یافتہ ناول The Falling Man ہے۔ یہ ایک ایسی تصویر کا عنوان ہے جو کہ گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی بلند و بالا عمارت سے گرتے ہوئے آدمی کی ہے اس پر ایک دستاویزی فلم بھی بن چکی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''یہ امر قابل غور ہے کہ گیارہ ستمبر کے حوالے سے لکھے جانے والے اکثر امریکی ناولوں کی کہانی شوہر اور بیوی کے درمیان ناموافقت ، نا آسودگی ، بیزاری اور عداوت کے گرد گھومتی ہے۔''(۲۷)

اونیل(O Neil) نے اپنے ایوارڈ یافتہ ناول Netherland میں زندگی کو ٹیسٹ کرکٹ سے تشبیہ دی ہے اوراس نے بڑے فن کارانہ انداز اور مسحور کن زبان میں اس امر کا تخلیقی انداز میں جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ ولیم گبش کے ناول Pattern Recognition کا موضوع بھی (محفوظ ماضی کی نئے سرے سے بازیافت ہے۔) جان اپڈائک(John Updike) کا ناول(Terroist) یہ کہانی ایک (نوجوان علم جہادی دہشت گردی) ہے۔جان اپڈائک(John Updike) ایک معروف امریکی فکشن نگار،شاعراور نقاد تھے انہیں بیسویں صدی کا معروف ترین امریکی ادیب کہا جاتا ہے۔ (Extremely Loud and Incredibly Close) جو نتھن سیفر ون کا ناول ہے۔جس میں ایک نو سالہ لڑکے اسکر زندگی پر گیارہ ستمبر کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف ''ایسے ناول کئی نقادوں کی تنقید کا نشانہ بھی بنے ہیں''(۲۸) محسن حمید ایک پاکستانی ادیب ہیں۔جنھوں نے زندگی کا کافی حصہ امریکہ میں گزارا ہے ان کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں اس میں گیارہ ستمبر کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ پاکستانی ادب پر بھی خاصی شدت سے اثر انداز ہوا۔سیاسی انتشار، بے اطمینانی اور معاشرتی جبر واستحصال،اوراس کے نتیجے میں ختم نہ ہونے والے دکھ ان جیسے موضوعات اردو ادب کا لازمی حصہ تصور کئے جاتے ہیں سیاست یا معاشرتی طور پر بھی کوئی بھی قابل ذکر واقعہ ہوا ہو تو اردو ادیبوں نے اسے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔گیارہ ستمبر کا واقعہ جو پاکستانی سرزمین سے کوسوں دور رونما ہوا پھر بھی اس کے اثرات ہم نے بھگتے پاکستان کی سیاست،معشیت ،معاشرت اور شہری زندگی کے امن وسکون پر منفی طور پر اثر انداز ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ افغانستان پر بھی وحشیانہ بمباری ہوئی،ادبی رسالوں میں بھی وقتاً فوقتاً ایسی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں جنس میں مقامی اور عالمی سیاست کے نشیب وفراز کو موضوع بنایا گیا۔نجیبہ عارف نے اس مقالے میں گیارہ ستمبر کے اثرات کو افسانوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے الطاف فاطمہ کے افسانہ ''دیدو ادید'' کی کہانی کے بارے میں یہ ہے کہ عراق جو ہمیشہ سے کہانیوں اور طلسم زا افسانوں کا مجموعہ رہا ہے امریکی حملوں

کے بعد خاص طور پر اردو افسانوں میں نمایاں رہا ہے الطاف فاطمہ کے اس افسانے کی کہانی ماضی پرست قوم کی ہے اس افسانے کی ہیروئن شہرزاد ہے جو اپنی کہانی بغداد کے ہارون الرشید کو سناتی ہے اور اسے یہ کہتی ہے کہ جب کبھی اسے اپنی مجبوریوں سے فرصت ملے تو وہ سچ لکھ سکے کیونکہ وہ چاہتی ہے دنیا بھر میں کسی بھی سچ بولنے کی اجازت نہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

''بی بی سی کے اس صحافی نے بھی تو سچ ہی بولا تھا جس کو اگلے دن موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور ہاں صدام کے مہلک ہتھیاروں کا جائزہ لینے والے اسلحہ کے سائنسی ماہر کا انجام بھی یاد کرو اور اس کے باوجود سچ بولنے کی جرات کرو گے تو صحافی اور اخبار نویس یا وقائع نگار کا حق ادا کرو گے۔''(۲۹)

مسعود مفتی کا افسانہ ''شناخت'' ۹/۱۱ کے بارے میں ہے یہ ان کی نمایاں کوشش ہے۔ اس کا موضوع امریکی پاکستانیوں پر گیارہ ستمبر کے واقعے کے غیر متوقع نتائج ہیں جو ان کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے گیارہ ستمبر کے بعد کی صورتِ حال کو وہ دھچکا قرار دیا ہے جس سے فلموں میں کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آئی ہے اور اچانک اپنے بچھڑے ہوئے چھوڑے ہوئے دوست پھر سے آشنا لگنے لگتے ہیں۔ جہادی تنظیموں کے شدت پسندانہ طرزِ عمل اور متوسط طبقے، ذہنی، فکری، روحانی اور اقتصادی استحصال پر منشا یاد کی کہانی '' ایک سائکلو وصیت نامہ'' ہے کہ افلاس اور غربت کس طرح ایک لڑکے کو مجاہد بننے پر مجبور کرتی ہے۔ مثال کے طور پر:

'' چند ماہ بعد دور کے ایک چچا محمد یحییٰ کے ساتھ عسکری تربیت کے لئے ایک جہادی معکسر پہنچے اور عسکری تربیت کے تمام مراحل بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیے یہ دور خاصہ کی تکمیل کے ساتھ ہی جذبہ شہادت دل میں موجزن ہوا۔(۳۰)

خالدہ حسین کا افسانہ ''ابن آدم'' اگرچہ گیارہ ستمبر کے واقع کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا ہے لیکن خودکش دھماکوں دہشت گردوں کے بیان میں ماضی کے ساتھ ساتھ ہم عصر واقعات کی اذیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''انسانیت کی تذلیل اور ان کے احساس آدمیت کو کچلنے کا جو باعث بنتا ہے یہی اس افسانے کی تفہیم ہے۔ خالدہ حسین نے بڑے موثر انداز میں اس موضوع کو بیانئے کی نیت میں اس طرح سمیٹا ہے کہ کسی اضافے جملے یا تبصرے اور راوی کی غیر ضروری مداخلت کے بغیر واقعاتی تسلسل اس شدت احساس کا مکمل ابلاغ کر دیتا ہے جو بیانیے کا حقیقی مقصد ہے''۔(۳۱)

مجال خواب'' ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ہے جس کو انہوں نے تمثیلی رنگ دینے کی کوشش کی ہے یہ کہانی قبرستان کے گرد گھومتی ہے۔ ہر کتبے پر عروج و زوال کی داستانیں رقم ہوتی ہیں اور کوئی بھی ان سے سبق نہیں سیکھتا یہ سبق ان کے لئے خاص طور پر اہم ہے جو قومیں عروج کے دور سے گزر رہی ہیں یہی اس کہانی کی تفہیم ہے۔ نیلوفر اقبال کا 'اوپریشن مائیس' افسانہ ہے اس میں گیارہ ستمبر کے بعد امریکی انتقام کی کہانی ہے جس کا ایک پہلو عراق میں حملے کی صورت میں نظر آیا جس میں جنرل مرسی کا مرکزی کردار ہے۔ یہ امریکی کردار متضاد رویوں میں نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں چار کردار ہیں ایسے لگتا ہے کہ کرداروں کے ذریعے افسانہ نگار نے گہرے طنز کی کیفیت پیدا کی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''افسانہ نگار نے بظاہر غیر جانب داری سے دونوں طرف کا نقطہ نظر بیان کیا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ دراصل اس تضاد کو اجاگر کرنا مقصود ہے جو طاقتور کے ضابطہء اخلاق میں واضح طور پر جھلکتا ہے اور جسے مبنی بر انصاف ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی منطق اور باطل دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے تاہم دوسری جانب جن کمزوریوں نے اس عمل کو تحریک دی ہے ان کا ذکر بھی بے باکی اور صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔''(۳۲)

نیلوفر کا دوسرا افسانہ جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ''سرخ حصے'' یہ افسانہ ''اوپریشن مائنس'' کے اگلے مرحلے کی کہانی ہے جو عراق کی جنگ میں جھونکے گئے دو امریکی نوجوان فوجی افسروں کے درمیان مکالمے اور ایک اختتامی منظر پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ خالدہ کا افسانہ ''کارگر'' ایک ایسی کہانی ہے جو خواب اور حقیقت کی سرحد پر جنم لیتی

ہوئی نظر آتی ہے اس میں معاصر زندگی کے اہم نشانات کو جن کران سے عصری تفہیم وتعبیری کوشش کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

> ''اس افسانے کی مجموعی فضا پر ہراس، بے یقینی، تلخی، کراہیت، جبر اور بظاہر اتفاقیہ محسوس ہونے والے واقعات کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ ہونے کا شبہ زندگی کی اس مجموعی زمانی و مکانی صورت حال کو بیان کرتا ہے جوارد گرد کے منظر نامے پر موجود ہے۔'' (۳۳)

عرفان احمد عرفی کا افسانہ ''ٹیلی شو'' حقیقت اور تخیل کی سرحد پر قائم کی جانے والی طلسماتی اور ڈرامائی کیفیت پرمبنی کہانی ہے جس میں آخر تک تجسس رہتا ہے۔ کہ ڈرامہ کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ ٹیلی شو ایک ایسے کھیل کو کہتے ہیں جو حقیقت نہ ہو مگر حقیقت دکھائی دے اس کہانی میں جو تجسس ہے وہی دراصل کہانی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

> ''افسانہ نگار نے عصری، بدامنی، دھماکوں اور تشدد اور دہشت گردی کی فضا کو ایسے ڈرامے سے تعبیر کیا ہے جسے پیش کرنے والے خود بھی بعض اوقات اس حال سے لا علم ہوتے ہیں کوئی نامعلوم طاقت اچانک ڈرامے کے واقعات کا رخ موڑ دیتی ہے کہانی کا پھیلاؤ کسی ایک ملک یا علاقے کی بجائے بین الاقوامی تعلقات اور سازشوں تک محیط ہے۔'' (۳۴)

زاہدہ حنا کے افسانہ ''نیند کا زرد لباس'' میں ایک افغان بچی کی مختصر زندگی کے طویل، گہرے اور شدید تجربات جو اس نے تیرہ سال کی عمر میں حاصل کیے تھے وہ بیان کیے گئے ہیں جب اس کی لاش باجوڑ پہنچی تو اس کی مٹھی میں ایک خط دبا ہوا تھا جو اس نے امریکہ کے صدر کے نام لکھا ہوا تھا یہ خط اس منافقت کا پردہ چاک کرتا ہے جس کے تحت بموں کے ساتھ ساتھ خوراک کے بنڈل بھی طیاروں سے پھینکے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف: ''اس افسانے کی کہانی براہ راست امریکی پالیسیوں کو نشانہ بناتی ہے اور انسانیت کے قتل عام پر فریاد کرتی ہے۔'' (۳۴) پروین عاطف کی کہانی ''اینڈ آف ٹائم'' بھی کسی ممکنہ ایٹمی جنگ کے بعد زندگی از سرنو پیدائش نمو کو

بیان کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''اس کہانی کے تھیم میں طاغوتی طاقتوں کے جبر واستبداد پر ایک گہرا لطیف طنز موجود ہے جو خود کو فنا اور بقا پر قادر سمجھتی ہے اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔کہ زندگی کا مرکز ان کی رسائی سے کہیں دور واقع ہے۔اور اس مرکز سے کہیں بھی کبھی بھی ایک نئے دائرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔(۳۵)

افتخار نسیم کا افسانہ ''پردیسی'' بھی مسعود مفتی کے افسانے شناخت کا ہی دوسرا رخ ہے اس کی کہانی بھی اسی کہانی کے گرد گھومتی ہے اس کا مرکزی کردار سلیم بھی اپنی شناخت سے محروم ہے اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ہندو ہے یا مسلم اس کہانی کا بنیادی تھیم بھی یہی ہے کہ انسانی حقوق کا چیمپین امریکہ بھی دراصل اسی امتیازی پالیسی پر کاربند ہے جو انصاف اور مساوات سے کوسوں دور ہے۔امریکی مسلمانوں اور پاکستانیوں کو اس حقیقت کا ادراک گیارہ ستمبر کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا۔

محمد حمید شاہد کی کہانی سورگ میں سور تمثیلی انداز میں عصری معاشرتی اور سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتی ہے اس کہانی میں بستی والے جنہیں بکریوں کے ریوڑ پالنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کا وصف ملا تھا جنگلی سوروں کے حملہ آور ہونے سے پریشان تھے جو ان کی بکریاں ہلاک کر دیتے تھے اس تدارک کے لیے انہوں نے کتے پالنے شروع کر دیے جواباً انہوں نے کتوں کی تعداد بھی بڑھائی لیکن یہ بھی بستی والوں کی حفاظت کرنے سے قاصر رہے۔مصنف نے بکریوں کتوں اور سوروں کے استعارے خوبی سے بیان کیے ہیں۔

عراق کی بربادی اور ماضی سے اس کا رشتہ انور زاہدی کے افسانے یہ جنگل کٹنے والا ہے موضوع ہے۔نجیبہ عارف کے مطابق اس میں کہانی کا راوی خواب میں خود کو بغداد کے ماضی اور حال کے نقطہ اشتراک پر موجود پاتا ہے۔مساجد و مقابر ہسپتال اور سکول باغ اور کھیت اس سب میں لہو رنگ ہیں اور آج کا ہلاکو اشرفیوں اور کنیزوں میں نہیں اور اس سیاہ توانائی کے ذخیروں میں دلچسپی رکھتا ہے جس سے اس کے کارخانے چلتے ہیں۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف اس کہانی کی بنیادی تھیم یہ ہے:

''ترقی روشن خیالی اور انسان دوستی کے دعوے محض خام خیال ہیں اور انسان آج بھی

اس حرص و ہوس کا اسیر ہے جو اسے انسانیت سے گرا کر درندگی کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔''(۳۶)

عطیہ سید کا افسانہ بلقیان کا بت یہ ایک ایسی کہانی ہے جو افغان بچے کی بارودی کھلونے سے دھجیاں بکھر جانے کی کہانی ہے۔ یہ بچہ اپنے ملک کے غاروں میں ایک بت دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا یہ بدھا کا بت ہے بدھا کا پرستار ہونا امن اور سکون کا پیغام دیتا ہے۔ نجیبہ عارف اس کہانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں:

''غیر ملکی بارلیش مقامی افراد کو بت کی مرمت کے لیے لاکھوں ڈالر دینے کے لیے تیار ہیں لیکن مرتے ہوئے بچوں کو زندگی کی نوید دینے کو تیار نہیں کہانی کی ایک جہت کو روشن کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے ثقافتی ورثے کی حفاظت پر مامور غیر ملکی ثقافت کے وارثوں میں موت بانٹتے پھرتے ہیں اور انسانیت کے نام پر سنگین اور وحشیانہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں''۔(۳۷)

فرخ ندیم نے اپنے افسانے چودھویں رات کی سرچ لائٹ میں انسانوں کو جانوروں کی طرح ہربی وور اور اومنی اوور کی خصوصیات سے بامتصف دکھایا ہے طاقت تیز رفتاری اور موقع پرستی یہ تین صفات ہیں جو گوشت خوروں کو مزید تین طبقات میں تقسیم کرتی ہیں نجیبہ عارف کے خیال میں مصنف کا اشارہ تیسری دنیا کے نااہل، کاسہ لیس مطلب پرست خود غرض اور قوت واقتدار کے حریص بے رحم حکمرانوں کی طرف ہے جو بیرونی طاقتوں کی مدد سے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور خود اپنی عوام کے حق میں بھوکے بھیڑیے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اور افسانہ مہاجر پرندے کے عنوان سے پرویز انجم کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں پرندوں کے درمیان مکالمے کی فضا پیدا کرنے کے لئے دونوں طرف دلائل پیش کیے ہیں مصنف کی کہانی کے تانے بانے سے یہ خیال متحرک نظر آتا ہے کہ تباہی اور بربادی کا شکار ٹوپی والے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''مصنف کا اصل مقصد انسان کی اپنے ماحول سے عمومی پیکار پر اظہار تاسف منظور ہے یا اہل مغرب کی مشرق پر عسکری یلغار کی شکایت واضح طور پر کہانی اجتماعی مسائل کے گرد گھومتی ہے جو مقامی بھی ہیں اور عالمگیر بھی۔''(۳۸)

مسعود صابر کے افسانے سرخ میں پاکستان کے ایسے دور افتادہ ضلع کی مقامی صورتحال کے بارے میں ہے جو چاروں صوبوں کے سنگم پر واقع ہے اور جہاں ایک معصوم دیہاتی شخص اچانک دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو جانے کے باعث شدید ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے اس وجہ سے اسے زندگی میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اس ضمن میں لکھتی ہیں:

''دہشت گردی سے عوام الناس کے اذہان پر پڑنے والے شدید دباؤ اور اس کے دیرپا اور دوررس اثرات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خون اور ادھڑے ہوئے گوشت کے مناظر ان شخصیتوں میں کیسے شدید انتشار کا باعث بنتے ہیں۔اور ان کی سائیکی پر کیسے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ (۳۹)

''لاوقت میں ایک منجمد ساعت'' عاطف سلیم کا افسانہ ہے اس کا مرکزی کردار خود کو کسی پراسرار مقام پر ایک کھوہ میں موجود پاتا ہے کھوہ کے دہانے پر تنتے ہوئے جالے اور ماضی سے کٹ کر گُم ہو جانے کی دہشت ہے اس کہانی میں علامتی رنگ بھی ہے اور مرکزی کردار شہر کے پر ہول مناظر میں خود کو ڈھونڈتا ہوتا ہے۔مگر اسے کوئی جواب نہیں ملتا، افسانہ نگار نے لکھا ہے کہ جس نسخے سے یہ کہانی نقل کی ہے اس کے صفحات کسی استعمار پسند کی جہنمی بھوک کا شکار ہو گئے ہیں۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

''جنگل کا اندھا قانون، طاقت کی حکمرانی، عوام کی بے بسی اور بے عملی، مل جل کر استحصال کی قوتوں کو مضبوط کرتے اور زوال کے عمل کو تیز تر کر دیتے ہیں''۔(۴۰)

علی حیدر کا افسانہ ''دہشت گرد چھٹی پر ہیں'' یہ افسانہ ملک میں ہونے والی وارداتوں کے پس پردہ خفیہ ہاتھوں کی نشاندہی کرتا ہے۔کہانی کا کردار جمیل شیرازی ''دہشت گردی، اسباب اور تدارک کی تدابیر'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں تقریر کرتا ہے اور حکومت کی اس مسئلے پر قابو پانے میں ناکامی کا اعلان کرتا ہے، مصنف نے دہشت گردی کے نام پر حکومتی خفیہ ایجنسیوں اور سکیورٹی اداروں کی شہریوں کے خلاف کاروائیوں کو موضوع بنایا ہے۔

افسانہ نگار مصطفیٰ کریم نے اپنے افسانے ''عجائب گھر'' میں انتہائی تند و تیز لہجے میں طنز کیا ہے کرداروں کے

نام بھی پاکستان کی تاریخی اور ہم عصر شخصیات کے ناموں سے ہیں۔ افسانہ نگار نے اسلام کے نام پر مذہبی گروہوں کی استحصالی مہم جوئی اور عاقبت نا اندیش پالیسیوں کے نتیجے میں جنم لینے والی بدامنی، طالبانائزیشن، عقل وشعور سے بے بہرہ مگر مسلح افراد کی معاشرے کو یرغمال بنالینے کی منظّم جدوجہد اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی بجائے حال کو ماضی سے بدل دینے کے امر حال پر اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دینے کے احمقانہ، نقصان دہ اور خوف ناک طرزِ عمل کو بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

''یہ افسانہ اپنے علامتی اور استعاراتی انداز کے باوجود مصنف کے نقطہءنظر کو بڑی وضاحت سے واشگاف انداز میں پیش کرتا ہے۔ اسلوب میں طنز استہزا اور شگفتگی دونوں نمایاں ہیں۔'' (۴۲)

ان افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے نجیبہ عارف لکھتی ہیں کہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اردو افسانہ محض اپنی جغرافیائی حدود کے اندر رہ کر زندگی کا مبصر اور ترجمان نہیں بلکہ مجموعی انسانی صورت حال کے الم ناک احساس سے لبریز ہے بغداد کے ہسپتالوں اور اسکولوں کی بربادی ہو یا فلسطین کے نوجوانوں کی موت سے ہمکلامی......جملوں میں شریک ہونے والوں کی بےبسی اور بے چارگی کی انتہا، اردو افسانے کی فضا میں انسانی المیوں کا رنگ جھلکتا ہے اور یہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محبت اور ان سے بچھڑ جانے کی اذیت کا بھرپور اظہار ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نجیبہ عارف کی یہ تنقیدی کاوشیں ان کی محنت شاقہ اور حسن ترتیب کی غماز ہیں ان کے ذریعے انھوں نے ممتاز مفتی کے پنہاں گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ممتاز مفتی کی فکر تک رسائی کو آسان بنادیا اور اس میں نئے امکانات تلاش کرنے کے عمل کو جاذب اور دلکش بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی پر مقدار اور معیار کے حوالے سے بہترین کام کیا ہے انھوں نے ''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء'' میں ممتاز مفتی کو نفسیاتی طور پر پرکھا ہے اور ممتاز مفتی کے ذاتی، سیاسی اور سماجی پس منظر کو نئے رخ سے سمجھایا ہے جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ممتاز مفتی کی ذہنی اور حقیقی زندگی میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ لکھتی ہیں۔ ''ممتاز مفتی کی تحریروں میں ذاتی زندگی کے بےشمار واقعات اسی انداز میں درج کیے گئے ہیں جس طرح ان کی روزمرہ گفتگو میں یہ سب باتیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوتی تھیں۔'' (۴۳)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی اس بات کی تصدیق ڈپٹی نذیر احمد کی اس رائے سے ظاہر ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

اگلے سال داستان گو پبلیشر یعنی اشفاق احمد خان نے ''بونی کا ناول''، ''علی پور کا ایلی'' چھاپا پڑنے کے بعد میں نے خاندان ان واقعات کی سچائی کی تصدیق کی کیونکہ مجھ سے بہتر کسی نے ''بونی'' کا وہ زمانہ نہ دیکھا تھا۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں میں نے وہ لسٹ مکمل کر لی جس میں کتابی اور اصلی نام ہیں یہی لسٹ علی پور کا ایلی نئی اشاعت میں شامل ہے۔ (۴۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کی شخصیت اور فن کا تجزیہ حقیقت پسندی کے ساتھ کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی تحقیق وتنقید کی بنیاد اس اصول پر رکھی کہ داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں کو سامنے رکھ کے مسلمہ حقائق کے ساتھ نتائج اور فکر کو پیش کیا ہے۔

ان کے نظام تنقید میں علمی، ادبی نفسیاتی عمرانی تنقید یکجا ہوتی ہے تو ان کی تنقید بذات خود ایک فن پارہ بن جاتی ہے انھوں نے اردو تحقیق وتنقید میں جرات پسندی اختیار کی ہے وہ اکثر تخلیقات کا جائزہ سیاسی وسماجی تناظر میں لیتی ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق وتنقید کسی خاص خانے تک محدود نہیں بلکہ وہ کسی بھی عہد اور ماحول کا تاریخی وسماجی مطالعہ کرنے کے بعد اپنا تجزیہ بھی پیش کرتی ہیں انھوں نے حقائق کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ سماجی عصری صورت حال اور شہادتوں کی مدد حاصل کر کے سچائی کو سامنے لایا ہے مثال کے طور پر انھوں نے ممتاز مفتی کا ''فکری ارتقاء'' میں ممتاز مفتی کی زندگی کو ادوار میں تقسیم کر کے اس دور کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں اس کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ممتاز مفتی کی زندگی پر سیاسی وسماجی حالات کس قدر اثر انداز ہوئے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق وتنقید کو سامنے رکھئے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ان ناقدین ادب میں شامل ہیں جو کسی خاص گروہ یا دبستان سے منسلک ہو کر خود کو محدود نہیں کر لیتے بلکہ ہر طرح کے نئے افکار کے لیے اپنے ذہن کے دریچے کھلے رکھتے ہیں اور ہر میدان میں اپنا قدم جما لیتے ہیں۔ ایسی ردوقبول میں ان کا تنقیدی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے فن پاروں تبصرہ کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ رویہ رکھا ہے ان کی تنقید کسی بھی ادب کے حسن و جمال کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

تبصرہ اور تنقید میں فرق ہے تبصرہ صرف تعارف کروانے، روشنی ڈالنے یا روشنی بکھیرنے کی حد تک ہے جبکہ

تنقید کا معیار اور ذمہ داری سے بڑھ کہ ہے اگر نجیبہ عارف کو بحیثیت نقاد دیکھا جائے تو ان کے ہاں بھی ہمیں تنقید سے زیادہ تبصرہ نظر آتا ہے مثال کے طور پر "9/11 اور اردو افسانہ'' میں انھوں نے مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کو شامل لیا ہے جو کہ 9/11 کے تناظر میں لکھے گئے تھے۔اس میں انھوں نے تمام افسانوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے لیکن ان کی تحریروں میں تنقیدی حسن نظر آتا ہے۔ان کی تحریروں میں مقصدیت ادبی سطح سے بلند نہیں ہوتی یہی ان کی تحریروں کا حسن اور ہیہ ان کی انفرادیت ہے۔

نجیبہ عارف نے بطورِ محقق ونقاد ممتاز مفتی کا ارتقاء ۹/۱۱ اور اردو افسانہ (انتخاب وتجزیہ) لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو کسی بھی محقق ونقاد کا خاصہ ہوتی ہیں۔اختلافی نکتہ چینی کی گرد بیٹھ جانے کے بعد اب ہماری ادبی تحقیق وتنقید کی دنیا میں ڈاکٹر نجیبہ عارف چمکتے ہوئے ستارے کی مانند ابھر کر سامنے آئی ہیں اور ان کی خوبیوں کا اعتراف ایک عمومی صداقت بن چکا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احتشام حسین، (مرتبہ) تنقیدی نظریات، لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۸۹

۲۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۹ء ص ۳۱

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، مکتبہء عالیہ لاہور، ص ۲۵

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، معاصر تنقید (مضمون) مطبوعہ: شمارہ ۸۔۹ جلد ۳، لاہور اگست ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۳۵۶

۵۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر، ''اردو تنقید کا ارتقاء''، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۳

۶۔ فراق گورکھپوری، ''اندازے''، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱

۷۔ سعدیہ طاہر، ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی وادبی خدمات: (تنقید کے حوالے سے) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، نیشل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگونجز اسلام آباد، جون ۲۰۱۰ء، ص ۲

۸۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اردو تنقید، اتر پردیش اردو اکیڈمی بھارت، ۱۹۸۷ء ص ۱۵۱

۹۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو میں تنقید، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص ۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۱۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، بک ایمپوزیم پٹنہ، ۱۹۸۳ء ص ۴۸

۱۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۱۷۶

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت دوم، ص ۱۵۰

۱۴۔ نیاز فتح پوری، انتقادیات (جلد اول) عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد ۱۹۴۴ء، ص ۶۹

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۶۰۸

۱۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء'' الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء'' الفیصل ۲ء شرانل ۲۰۱۱ لاہور ص ۳۱

۲۰۔ ایضاً،ص۳۷

۲۱۔ ایضاً،ص۱۳

۲۲۔ ایضاً،ص۱۳

۲۳۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء''الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۱ء،ص۲۵۱

۲۴۔ ایضاً،ص۲۶۸

۲۵۔ بانو قدسیہ،مراد بریشم،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۱۹۸۹ء، ص۲۰۔۱۹

۲۶۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء'' الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۱ء،ص۳۳۹

۲۷۔ ایضاً،ص۵۲۵

۲۸۔ مظہر جمیل،پیش لفظ،''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ)، نجیبہ عارف ،پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۷

۲۹۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ)،پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۱۳

۳۰۔ ایضاً،ص۱۵

۳۱۔ ایضاً،ص۱۹

۳۲۔ الطاف فاطمہ،''دیدہ و دید''،(افسانہ)مشمولہ''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ) نجیبہ عارف، پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۵۵

۳۳۔ منشاء یاد،''ایک سائیکلو وصیت نامہ''(افسانہ)،مشمولہ:''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ)،نجیبہ عارف،ڈاکٹر، پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۹۵

۳۴۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ)،پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۳۴

۳۵۔ ایضاً،ص۲۹۔۲۸

۳۶۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''۹/۱۱ اور اردو افسانہ''(انتخاب و تجزیہ)،پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۳۹

۳۷۔ ایضاً،ص۳۳

۳۸۔ ایضاً،ص۴۱

۳۹۔ ایضاً،ص۴۵

۴۰۔ ایضاً،ص۴۴

۴۱۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''۱۱/۹اور اردو افسانہ'' (انتخاب وتجزیہ)، پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۴۴

۴۲۔ ایضاً،ص۴۳

۴۳۔ نجیبہ عارف ، ڈاکٹر ،''۱۱/ ۹اور اردو افسانہ'' (انتخاب و تجزیہ) ، پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،
ص۳۷۔۳۶

۴۴۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''۱۱/۹اور اردو افسانہ'' (انتخاب وتجزیہ)، پورب اکادمی اسلام آباد مئی ۲۰۱۱ء،ص۴۷

باب سوم

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحثیت محقق

ڈاکٹر نجیبہ عارف گو کہ ایک بڑا نام ہے اور ادبی حلقوں میں ان کی پہچان بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اس باب میں تنقیدی و تحقیقی مقالات و مضامین زیر بحث رکھے جائیں گے اس حوالے سے ان کی کتاب ''رفتہ و آئندہ'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ممتاز مفتی سے لے کر محمد حمید شاہد تک متعدد ہم عصر افسانہ نگاروں اور تخلیقات کو مدِ نظر رکھ کر نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کے بارے میں فتح محمد ملک کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نجیبہ عارف جدید تر اردو تنقید کا ایک نیا نام ہیں وہ تنقید و تحقیق کی دنیا میں نو وارد ضرور ہیں مگر نو آموز ہر گز نہیں ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ گہرا اور اسلوب تخلیقی ہے ہر چند یہ کتاب ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے تاہم یہ مضامین کسی بلندی کی بجائے ایک پختہ کار ادیب کے ذہن و ذوق کا پتہ دیتے ہیں''۔(۱)

''رفتہ و آئندہ'' کتاب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ دور جدید کی تہذیبی ساخت اور اسلام......فکر اقبال کی روشنی میں اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقاء۔اردو ادب میں تانیثیت کی تحریک، حصہ دوم شعری اور تیسرا حصہ نثری ادب کے حوالے سے ہے پہلے حصہ میں دور جدید کی تہذیبی ساخت اور اسلام فکر اقبال کی روشنی میں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔تہذیب کیا ہے؟ اس کے بارے میں آگاہ کیا ہے۔تہذیب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> ''بطور ایک اصلاح یہ لفظ عموماً کلچر یا ثقافت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے تاہم کچھ علما اسے ثقافت سے وسیع تر مفہوم کا حامل قرار دیتے ہیں اور کچھ اس سے برعکس صورت حال پر یقین رکھتے ہیں مجموعی طوع پر یہ اصطلاح انسانی معاشروں میں جاری و ساری اس فکری اور عملی رو کا نام ہے جو معاشرے کی حرکت اور ارتقاء کا باعث بنتی

ہے۔''(۲)

اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے تہذیبی اقدار، معاشرتی اقدار جو کم وبیش ساٹھ سال کے دوران امریکی معاشرے میں جو روایات تدریجی ارتقاء کے مرحلے سے گزر کر صورت پذیر ہوئیں اس حوالے سے بات کی ہے تہذیب کی اساس کس نظریے پر قائم ہے دیکھا جائے تو تہذیب اپنی جن خصوصیات پر ناز کرتی ہے ان میں جمہوریت، آزادی مساوات اور انسانی حقوق کی حفاظت ہیں۔ جدید تہذیب کے حوالے سے جو اقبال کے افکار تھے اس کے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

''مغربی افکار و تمدن کے مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپنی تمام تر عقلی و سائنسی ترقی کے باوجود جدید تہذیب ایک بے روح قالب ہے اور اگر اسے زندگی کے روحانی پہلو سے آشنا نا کیا گیا تو یہ اپنی موت آپ مرجائے گا۔(۳)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے خیال کے مطابق اسلامی تہذیب دراصل ایک بڑے اور وسیع تر نظریاتی ڈھانچے کا نام ہے اور غور وفکر کو اسلامی تہذیب کے اساسی عمل کی حیثیت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے انسانیت کے عالمگیر اتحاد کے لئے باہمی اخوت اور بھائی چارے کی اس فضا کی تشکیل کو ضروری قرار دیا ہے اور اکیسویں صدی میں انسانی فہم وشعور نے جتنی ترقی کر لی ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اسے عقل واستدلال کی سطح پر زندگی کے ایک لازمی تقاضے کی صورت میں اسے اجاگر کیا جائے نہ کہ ایک چیز کی صورت جسے انسانی فطرت کبھی قبول نہیں کرتی۔ اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقاء'' اس حصے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقید کے بنیادی موضوعات میں تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے اس بارے میں ان کا موقف ہے کہ شاعر اور صوفی ایک حدِ فاصل موجود ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اردو نثر کا تصوف سے بہت قدیم اور گہرا رشتہ ہے۔ اور اردو ادب نے بنیادی طور پر تصوف ہی سے فکری اڑان اور جذباتی گہرائی حاصل کی ہے۔ وہ ادب میں تصوف کو اس نظر سے دیکھتی ہیں۔

''تصوف ادب کی رہنمائی الہامی اور وجدانی احساس کی مدد سے کرتا ہے۔ جو اسے مذہب سے لگاؤ مخلوقِ خدا کی خدمت اور عرفانِ ذات کی خواہش کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اور یوں ادب اور تصوف دونوں بالآخر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں

نظر آتے ہیں''۔(۴)

اردو زبان وادب کی ترویج کے لئے صوفیاء کرام اور اولیاء کرام نے بہت نمایاں کردار ادا کیا شمال ہند میں افسانوی نثر کا آغاز بھی نواب عیسوی خان کی تصنیف کردہ داستان ''مہر افروز و دلبر'' سے ہوا پہلے پہل کہانیوں میں مافوق الفطرت کرداروں کے بھی عناصر ملتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی گئی افسانوی نثر میں بھی ہندی اور اسلامی تصوف کے اثرات نظر آتے ہیں پھر اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ غبار خاطر میں بھی صوفیانہ تفکر کا تال میل صاف دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے اس مقالے میں پاکستانی افسانوی ادب کے حوالے سے بھی بات کی اور انتظار حسین کے افسانوی مجموعے ''آخری آدمی''(۱۹۶۶ء) کے تمثیلی اسلوب کے نئے فنی اور فکری امکانات کو دریافت کیا۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''انتظار حسین کی کہانیاں اس بھیانک خلا کا نقشہ پیش کرتی ہیں جو عہد جدید کی کھوکھلی قدروں اور سطحی طرز زندگی نے انسانی روح کے باطن میں پیدا کر رکھا ہے وہ اس اساطیری حوالوں، تمثیلچوں اور صوفیانہ اصطلاحات کے ذریعے جدید آدمی کی بے سمتی بے جہتی کو بے نقاب کرتے ہیں اور اپنے تاریخی شعور اور زمانی تسلسل کے احساس کو اپنے کرداروں میں سمو کر پیش کرتے ہیں(۵)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے اس مقالے کو مستند بنانے کے لئے بہت سے مصنفوں کی رائے کو بھی شامل کیا ہے۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اردو میں فلسفہء جمالیات جیسی اعلیٰ اور منفرد کتاب کے مصنف ہیں نجیبہ عارف نے اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو قیام پاکستان کے بعد اردو افسانوی ادب پر ممتاز مفتی کے متصوفانہ رجحانات کے اثرات لئے ہوئے ہے۔ ''لبیک'' ممتاز مفتی کی سب سے زیادہ تہلکہ خیز اور رجحان ساز کتاب ثابت ہوئی اور اس نے اردو ادب میں ایک سنسنی کو جنم دیا جس کی بازگشت دیر تک دنیائے ادب کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔ لبیک چونکہ ممتاز مفتی کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ثابت ہوئی ممتاز مفتی کی لبیک کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کہنا ہے

''ممتاز مفتی اگر یہ کتاب نہ لکھتے تو شاید اشفاق احمد کو بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے کی

ہمت نہ ہوتی اور اصغر ندیم سید کے ڈرامہ سیریلز میں بھی مزاروں اور قوالیوں کے منظر نہ دکھائی دیتے''۔(۶)

افسانوی ادب کے متصوفانہ رجحانات کا تذکرہ کرتے ہوئے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا تذکرہ نہ کرنا ناگزیر ہے کیونکہ ان دونوں کا تعلق بھی قدرت اللہ شہاب کے حلقہء ادارت سے ہے۔ بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑی خوبصورتی سے لکھا ہے۔ کہتی ہیں کہ اس ناول میں بانو قدسیہ نے کائنات میں انسان کی تخلیق اور اس کی مسلسل جستجو، ابدی زندگی کی خواہش، اس کی فکری بے سمتی اور کج روی، ذہنی انتشار، احساس محرومی، اور عشق لاحاصل سے پیدا شدہ دیوانگی پر سیر حاصل بحث کی ہے راجہ گدھ کے کردار سے انھوں نے ناول میں معنویت تہ داری اور رمزیت کی ایسی فضا قائم کی ہے جو کرداروں کی داخلی حسیات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ناول کے بنیادی خیال کی مطلب افروزی میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے چیدہ چیدہ تمام افسانہ نگاروں اور ان نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے جن کی نثر میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے واصف علی واصف، عزیز ملک ایک اور معتبر نام مختار مسعود کا ہے اجمل نیازی کا تعلق بھی ان ادیبوں کے گروہ سے ہے جن کے ہاں ادبی نثر میں صوفیانہ مزاج واضح طور پر نظر آتا ہے پھر عہد حاضر کے افسانہ نگار محمد سعید شیخ ان کے ہاں بھی متصوفانہ رجحانات کا بہاؤ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ممتاز مفتی کے ساتھ ساتھ ایک اور نام کرنل ڈاکٹر ابدال بیلا کا بھی انھوں نے ذکر کیا ابدال بیلا کے فن اور فکر پر ممتاز مفتی کے گہرے اثرات ہیں۔ آخر میں قراۃ العین حیدر کے بارے میں اپنی رائے دیتی ہیں۔ عہد حاضر کی ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے اردو ادب کا دامن اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے روشن کر دیا۔ کیونکہ ان کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے نزدیک تنقید کا اصل مقام یہ ہے کہ وہ تخلیق کے جملہ العباد تک رسائی حاصل کرے۔ اس کے علاوہ زاویہ نگاہ کا چہار سمت دائرہ کار ہونا لازمی ہے۔

''اردو ادب میں تانیثیت کے تحریک'' مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے عورتوں کے حقوق کی تحریک کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صرف بین الاقوامی سطح پر معاشرتی نظریہ ہی نہیں بلکہ سیاسی تحریک بھی ہے جو عورت کے رتبے اور کردار اور تشخیص کے اظہار کا یقین دلاتی ہے۔ جدید دنیا میں تحریک حقوق نسواں واضح ترجیحات

کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے کیونکہ پہلے زمانے میں جن مسائل کو حل کرنا آسان نہ تھا۔ مثلاً جیسے عورتوں کو تعلیم دلوانے کے حقوق حاصل نہیں تھے یہی سوچ کر کہ کہیں تعلیم ان عورتوں کو سرکش اور باغی نہ بنا دے اور آج کی عورت بلاشبہ باہمت عورت ہے جو کہ اس کی مجاہدانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اب ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بہت سی شاعرات خواتین نے عورت کی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی۔ ان میں زہرہ نگار کشور ناہید، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر کے نام نمایاں ہیں۔ اس کے بعد افسانوی نثر میں بھی جن خواتین نے خواتین کے معاشرتی کردار کو موضوع بحث بنایا ان میں قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ، خالدہ حسین، بشریٰ رحمٰن وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر نجیبہ عارف افسوس کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

> ''مجموعی طور پر آزادی نسواں کی تحریک پاکستان میں اس سطح پر منظّم اور فعال نہیں ہو سکی جس طرح مغربی ممالک میں نظر آتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں سب سے بڑی وجہ عدم استحکام اور مختلف قسم کی طرزِ حکومت کے پردے میں مطلق العنانی کا رواج ہے''۔(۷)

عورت کو اپنی ذات اور تکمیل کے اظہار کے وہ تمام مواقع ملنے چاہئیں جو اب تک صرف مرد کا حصہ سمجھے جاتے ہیں اس حوالے سے دیکھا جائے تو تحریک حقوق نسواں ابھی بھی اردو ادب میں اپنے مکمل اور تخلیقی اظہار کی منتظر ہے۔ (حصہ دوم) شعری ادب پر مشتمل ہے جس میں سب سے پہلے ن م راشد کی شاعری کے ارتقائی مراحل کے بارے میں ہے۔ ن، م راشد بلاشبہ ایک بڑا نام ہے کیونکہ تخلیق ایک پیچیدہ عمل ہے اور انسان بذات خود روحانی عناصر کا ایک شفاف آئینہ ہے تو اسے چاہیئے کہ اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی شخصی دریافت کے بارے میں کسی دوسرے انسان کی جان کاری کروائے اور پھر اس کے بعد دونوں مل کر تیسرے کو اس تخلیقی عمل سے گزاریں تا کہ اس کی جملہ فن کاریاں واضح طور پر نمو پائیں اور اپنی پوری نفاست کے ساتھ زمانہ کے روبرو ہوں تا کہ اس سے کسی چوتھے کی تخلیق ممکن ہو سکے یعنی اگر ایک علم کا ایک چراغ روشن ہے تو اس سے لاکھوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں جو اپنی حدت سے بھی مستفید ہوں اور دوسروں کو بھی باہم فائدہ پہنچا سکیں۔ ن، م راشد بلاشبہ باکمال شاعر تھے اور کوئی بے

کمال اس کی شاعری کی تفہیم نہیں کر سکتا ان کے ہاں خود سے محبت وقت پر نظر مظاہر فطرت کی کارکردگی باطنی وخارجی اور ارضی وسماوی اور مادی وروحانی کیفیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ن،م راشد ایک سچا تخلیق کار تھا۔ڈاکٹر نجیبہ عارف ان کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''راشد کی شاعری فکر کی کلید جستجو ہے یہ جستجو تسکین ذاتی کی تلاش سے شروع ہوتی ہے جو بیسویں صدی کے فرد کو کہیں بھی میسر نہیں۔نہ کسی عشرت شبینہ میں نہ کسی گناہ بے لذت میں، نہ کسی مینار کے سائے تلے نہ کسی محراب کی چھاؤں میں''۔(۸)

انھوں نے جو بھی لکھا بے مثال لکھا ان کا کلام فکری سطح پر انسان کائنات اور وقت اور اس کے متعلقات کے برتاوے میں توازن کو ہر سطح پر قائم رکھتا ہے۔ن،م،راشد اپنی ذات میں مکمل انسان تھے اور انسان کا جو ربط اقدار حیات سے ہوتا ہے کائنات سے ہوتا ہے یا مظاہر فطرت سے ہوتا ہے اس کو وہ آفاقی سطح پر زیر بحث لاتے ہیں کائنات میں انسان کی حیثیت اور وقت سے کسی بھی لمحے صرف نظر نہیں کرتے۔راشد کے ہاں چڑچڑاہٹ اور تلخی کا احساس نمایاں ہے ان کی شاعری کا امتیاز بھی یہی ہے کہ وہ من کی صداقتوں کا اظہار ہے۔ان صداقتوں کا جن کا اظہار کرنا بڑی جرات کا کام ہے ن،م راشد کے ہاں مغرب ومشرق کی تقدیر کا فرق بھی مسلسل رہا ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''اقبال کے بعد ن م راشد وہ دوسرے شاعر ہیں جنھوں نے مشرق ومغرب کے درمیان مغائرت اور ذہنی وفکری،تہذیبی وثقافتی اور معاشی وسیاسی سطح پر کارفرما امتیازات کو اپنی شاعری کا تسلسل سے موضوع بنایا ہے۔''(۹)

نظم ''پہلی کرن''میں انہوں نے ایک نئے دور کی بشارت دی ہے ان کی نظم ''ایران میں اجنبی'' سے جو سفر فرد کی پامالی اور غلامی کے خلاف نفرت واذیت کے اظہار سے شروع ہوتا ہے وہ ''لا'' انسان گمان کا ممکن تک پہنچتے پہنچتے انسانی روح کی گرفتاری اور ہیچ رفتاری کے خلاف ایک صدائے احتجاج بن کر ابھرتا ہے۔اپنی نظم ''گداگر'' میں وہ اس نئے انسان کے سامنے موجودہ انسان کی راہ پیمائی مصاگیری پر اپنی شرمندگی اور خجالت کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''گماں کا ممکن''ان کی آخری کتاب ہے جس میں حسن ''کوزہ گر'' کے سلسلے میں آخری تین نظمیں شامل ہیں۔ان کے ہاں ایک اور تصور نظم میں ابھر کر سامنے آتا ہے وہ وقت کا تصور ہے وہ وقت کو ایک پتنگے سے تشبیہ

دیتے ہیں جو ہر وقت رینگتا چلا جاتا ہے ان کے لہجے میں جو مایوسی اور ناامیدی ہے وہ ان کی نظموں میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔احساس تنہائی،خود اپنے آپ کو پالینے کی آرزو،اور اپنا اظہار کرنے کی ناکام سعی راشد کی شاعری میں ایک گہرا سوز پیدا کر دیتی ہے۔''اندھا کباڑی'' آگی ہے ریت،''مجھے وداع کر''اور سفر نامہ'اسی کرب کا اظہار کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''ن،م راشد کی شاعری زمان ومکان کے ان تصورات پر بنیاد رکھتی ہے جو ٹھوس اور مادی نہیں سیال اور غیر مادی ہیں وقت لکیر نہیں جس پر حال ماضی اور مستقبل یکے بعد دیگرے دکھائی دیتے ہیں یہ ایک دائرے کا سفر ہے جو لمحہ بہ لمحہ پھلتا جا رہا ہے۔''(۱۰)

''فیض کی مقبولیت کے اسباب'' کے حوالے سے یہ مقالہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے بہت خوبصورتی سے لکھا ہے کیونکہ کسی بھی شاعر یا ادیب کے حوالے سے جاننے کے لیے اس کی شخصیت،سوانح،نظریاتی وسیاسی افکار اور اس کے عہد کے نمایاں رجحانات کا مطالعہ بہت ضروری ہوتا ہے اور فیض احمد فیض اردو ادب کی مقبول ترین ہستی ہیں یہ بھی خوش قسمتی کی بات ہے انھیں اپنی زندگی میں ہی کثیر مداحوں کی تعداد میسر آئی اور لوگ انھیں دیوتا کی طرح چاہتے تھے وہ ہر نسل کے لوگوں کے پسندیدہ تھے جبکہ ایسی دلعزیزی اور مقبولیت کا ایک ردعمل بھی ہوتا ہے مخالفین نے ان کے مضوعات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ان کی ذاتی زندگی اور طرز بود و باش پر بھی لعن طعن کی فیض صاحب کی شخصیت میں محبت اور دلنوازی کا عنصر بہت نمایاں تھا فیض کے ہاں کلاسیکی روایات کا بھی گہرا اثر ملتا ہے انھوں نے مغربی شاعری کے موضوعات کو بڑے تخلیقی انداز میں شاعری میں سمویا ہے ان کی شاعری میں گہرا کرب اندروں ایک دبی دبی سی ٹھیس کی لذت ایک مدھم سلگتا ہوا سوز اور دل لگی کا اجالا سا ملتا ہے۔فیض نے جدید فکر کو کلاسیکی عدائم و رموز کے پرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ عام سی بات بھی ایک خیال انگیز مبہم سی دھند میں لپٹ کر پیچیدہ اور گہری ہو گئی، بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''فیض کی نظموں میں ایک ایسا آہنگ ہے جو دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے فیض نے اپنی نظموں کی اندرونی ترکیب میں ایسی غذائیت رکھی ہے جو قافیے

ردیف کی عدم موجودگی میں بھی نغمے کا سماں باندھ دیتی ہے واسوقت و واسوخت ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور دعا جیسی نظمیں اس خوبی کی عمدہ مثالیں ہیں۔''(۱۱)

ان کے لہجے میں ایک دھیما دھیما ساغم اور مستقل اداسی نظر آتی ہے موسیقی ہو یا شاعری غم کے نغمے ہمیشہ دلوں پر زیادہ اثر کرتے ہیں۔فیض کی شاعری کو اگر دیکھا جائے تو ان کی شاعری پر اول تا آخر اسی نامعلوم سے احساس غم کی حکمرانی رہی ہے نقش فریادی سے لے کر''مرے دل مرے مسافر''اور''غبارایام'' تک فیض کی شاعری بڑے غیر محسوس طریقے سے ایک نامعلوم غم کی آنچ پر سلگتی اور دکھتی ہوئی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس سے بے تعلق رہنا دستوار ہے شاید یہی تاثیر ہوسکتا ہے جو کہ فیض کو پرانا نہیں ہونے دیتا۔ان کی نظموں میں اداس کیفیت دھوپ چھاؤں کے رنگ نظر آتے ہیں یہ اداسی کہیں کہیں مایوسی کی جھلک بھی دکھاتی ہے اور ہلکی ہلکی چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے خاص طور پر ان کی آخری نظموں میں قنوطیت کا احساس زیاں کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے یا عمر کے آخری حصے میں جنم لینے والے رائگانی کے اس عمومی احساس کا نتیجہ تھی جو ہر حساس دل کو اپنی مٹھی میں دبا لیتا ہے''غبارایام''،تم ہی کہو کیا کرنا ہے'اس وقت تو یوں لگتا ہے ان کی ہجر کی راکھ دیا میں'اور آج شب کوئی نہیں ہے'' ان میں انتہاہ اداسی اور تنہائی کے سناٹوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''فیض کے بارے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ترکھان یا لوہار تھے نہ فلسفی اور نہ صحافی وہ شاعر تھے۔سچے اور اصلی شاعر''۔(۱۲)

''منیر نیازی کی طلسمی کائناتِ شعر'' منیر نیازی ایک ایسے شاعر تھے جن کی شاعری نے عہد کی ناتوانی فنا پذیری اور شکست خوردگی کو جس طرح تخلیقی سطح پر بیان کیا ہے۔اس کی مثال نہیں ملتی۔''منیر نیازی کی طلسمی کائنات'' اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے مختلف حوالوں سے منیر نیازی کی سادہ دل شخصیت کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ منیر نیازی کے ہاں زندگی کے سیاسی معاشی اور فکری مسائل کو جوں کا توں بیان کرنے کا رویہ نہیں ملتا ان کی شاعری میں کہیں کہیں بغاوت اور کہیں درد و کرب کی لے نظر آتی ہے ان کو رات سے گہرا لگاؤ ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''منیر نیازی اپنے عہد کی ایک منفرد آواز ہے انہوں نے اپنے شعار میں ایک ایسی

جمال افروز فضا تخلیق کی ہے جس کی مثال اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتی ان کے الفاظ، خیال اور امیجری مل کر ایک ایسی نقش چادر بنتے ہیں جس میں تصورات کے مسلسل پھیلتے ہوئے دائرے بنتے ہیں اور ان دائروں کے اندر کئی دنیائیں آباد دکھائی دیتی ہیں''۔(۱۳)

اگلا مقالہ ''افتخار عارف بیسویں صدی کی تنہائی کا شاعر'' ہے اس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے افتخار عارف کی تنہائی کا شاعر ہونے کی وجوہات کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ یورپ میں دو بڑی جنگوں کا نتیجہ ہی ان کی تنہائی کی وجہ نہیں بلکہ بے شمار اسباب اور عوامل ہیں پھر ساٹھ کی دہائی میں نظم و نثر دونوں ہی نمایاں طور پر سامنے آئی حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم میں بھی جو ادب تخلیق ہوا تھا اس میں کرب اور احساس تنہائی واضح طور پر نمایاں تھی انہوں نے زندگی کے مسائل کو اپنی ذات کا تجربہ بنا کر محسوس کیا ہے بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''وہ بدلتی ہوئی سماجی و معاشرتی اقدار پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس محرومی و شکست سے بھی غافل نہیں ہیں ان کی شاعری بنیادی طور پر اسی محود کے گرد گھومتی ہے انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی ذہنی و نفسیاتی فضا کا جیسا نقشہ کھینچا ہے وہ ان کے معاصر شعراء کے ہاں اس انداز میں نظر نہیں آتا۔''(۱۴)

ان کی شاعری میں خوف، کشمکش اور کرب کا اظہار ہوتا ہے نجیبہ عارف نے ایک اور اہم بات بتائی گئی ہے کہ ان کی شاعری میں اقبال اور راشد دونوں کے رنگ ابھرتے ہیں افتخار عارف کی شخصیت جس وضع داری اور تہذیبی رنگ ڈھنگ سے عبارت ہے اس کا مکمل اظہار قدیم و جدید کی آمیزش سے ہوتا ہے۔''انور مسعود ایک فیض یافتہ شاعر ''اس مقالے میں انور مسعود کی درویش شخصیت کا ذکر کیا ہے اور انور مسعود کی زندگی کا ابتدائی دوران کے حالات ان کی تعلیم پیدائش اور ان کے شجرہ نسب کے بارے میں بتایا گیا ہے ان کو پنجابی کا نظیر اکبر آبادی قرار دیا جاتا ہے ان کے اشعار میں ایک راز دار دل کی معنی خیز خاموشی کی کھنک ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے انور مسعود ایک اچھے شاعر ہی بلکہ نہیں گہرے تنقیدی شعور اور تحقیقی لگن کے بھی مالک ہیں۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''ان کے لہجے اور بیان میں ایک مستانہ روی تسلسل اور روانی نظر آتی ہے ان کی پنجابی شاعری میں جو بے ساختگی اور کھرا پن ہے وہ اپنی مثال آپ ہے یہ وہ سچا پنجابی لہجہ ہے جس میں شدتوں بھرے جذبے کا خلوص، لوک دانش کی گھمبیرتا، ہرے میدانوں کی سی وسعت و ثروت فکر اور سرسبز کھیتوں کی سی زرخیزی تخیل گھل مل کر ایک ایسا نویکلا اور دلکش آہنگ ترتیب دیتے ہیں جس کی لے پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔''(۱۵)

''اگلا مقالہ احسان اکبر کا شعری شغف'' ہے اس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے احسان اکبر کی شعری خصوصیات اور ان کی ابتدائی شاعری سے لے کر اب تک تمام شاعری کے بارے میں بات کی ہے۔ ان کی شاعری بطون ذات سے نکلی ہوئی ایسی ہی سرگوشی ہے جس میں سرمستی اور بے خودی کے کیف سے لبریز بے حجابانہ در آئے ہیں ان کے ہاں ایک پر شوق وارفتگی اور ایک والہانہ شیفتگی ہے اس آتش شوق میں ناز اور نیاز دونوں کے رنگ جھلکتے ہیں اور یہی آگ ان کی پہچان بنتی ہے شاعر معاشرے کا دل ہوتا ہے دھڑکتا اور تڑپتا ہوا دل خواب دیکھنے اور انہیں تعبیر کرنے کی آرزو میں مبتلا دل جو زندگی کے نقشے میں رنگ بھرنا چاہتا ہے اپنی مرضی کے رنگ احسان اکبر نے بھی یہی چاہا ہے مگر ان کی مرضی بھی وہی ہے جو دوست کی مرضی ہے وہ دنیا کو ویسا دیکھنا چاہتے ہیں جیسا چودہ سو سال پہلے کسی نے بنا دیا تھا وہ چودہ سو سال کی یہ مسامت ان کی نظموں میں پاؤں پاؤں چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''ان کی شاعری کسی ایسی وحدانی کیفیت کا مظہر ہے جہاں صریر خامہ ہی نہیں، دل شاعر بھی نوائے سروش کی اپنی ایک دنیا ہے من کی دنیا جہاں زندگی کا سراغ ملتا ہے احسان اکبر کی شاعری اسی دنیا کا چراغ ہے۔''(۱۶)

''انعام الحق جاوید کی عصری حسیت'' مزاحیہ شاعری کے تناظر میں اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے مزاحیہ شاعری کے بارے ہونے والی صورت حال کو مدنظر رکھا ہے ان کے خیال میں عہد حاضر میں سنجیدہ شاعری کو قاری تو میسر ہیں مگر سامعین صرف مزاحیہ شاعری مانگتے ہیں مزاحیہ شاعری گو کے اعصابی تناؤ کو کم کر دیتا ہے ڈاکٹر انعام الحق کی مزاحیہ شاعری بھی ایسی ہی تھراپی ہے ان کی ادبی تخلیق کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑی

خوبصورتی سے بتایا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی مزاحیہ شاعری ہم عصر سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال کا آئینہ ہے انھوں نے ہلکے پھلکے انداز میں بظاہر معاشرے کی ناہموار حال پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے مگر اسی سرسری نظر کے پیچھے ایک حساس دل کی تڑپ اور ایک توانا شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''(۱۷)

انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لے اپنی عصری شعور کا اظہار کیا ہے ان کی شاعری عہد کی سماجی تاریخ قرار دی جاسکتی ہے۔ محمد اظہار الحق کی شاعری ''پانی پر بچھا تخت کے حوالے سے یہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا مقالہ ہے اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ محمد اظہار الحق کی شاعری کلاسیکی شاعری سے ہٹ کر شاعری ہے اور یہ کہ اردو شاعری کا رنگ و آہنگ خاصی تبدیلیوں کا شکار بھی رہا ہے ان کی شاعری میں بیسویں صدی کے انسان کا لب و لہجہ سنائی دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''اظہار الحق کے شعری لہجے کی خاص پہچان ان کا یقین ہے یقین کے کئی فائدے ہیں اور کئی نقصان فائدہ تو یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے کئی مشکل مرحلے اس کے سہارے ایک استقامت ایک سلامت روی سے گزار دیتا ہے اور نقصان یہ کہ نمو اور زرخیزی کے کئی امکانات جو ظہور میں آسکتے تھے، یقین کی سنگینی تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔''(۱۸)

''پروین طاہر کی نظمیں''ان کی شاعری کی یہ خوبی ہے یہ ہر قاری سے الگ انداز میں بات کرتی ہیں ان کے ہاں یاس اور آس کی کیفیت میں جینے کا چلن نظر آتا ہے وہ خود پر بے بسی کی مہر طاری نہیں ہونے دیتی یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری سفر نئے نئے رنگوں اور ذائقوں کے کیف آفریں لمحوں کی داستان ہے اور کسی چوتھی سمت سے آتی نداؤں کی بازگشت سے مشکبار ہے یہ ظاہر سے باطن کا سفر ہے اس سفر کا ہر قدم کسی نہ کسی بشارت کا چشمہ ڈھونڈ لیتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اپنی اپنی بشارتیں خود تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ ان کی شاعری کی ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس طرح تعریف کی ہے۔

''پروین طاہر کی شاعری عالم خواب کی شاعری ہے یہ تخیر کے ان لمحوں کی داستان ہے جو انسانی فہم کے تنگ دائروں سے باہر نکلنے پر وارد ہوتے ہیں یہ وجود سے ماورا حقیقتوں کا لمس ہے یہ آئینہ در آئینہ عکس ہے۔''(۱۹)

''حمیدہ شاہین کی شاعری'' دستک' سے دشت وجود تک گو کہ اس مقالے میں بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان کی زندگی کے خاص پہلو پر روشنی ڈالی ہے ان کی ذات کے حوالے سے ابتدائی زندگی کے بارے مین بیان کیا ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے سماجی زندگی میں عورت کا مقام حمیدہ کی شاعری میں اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے ان کے لہجے میں فکر و خیال کے عمق کے ساتھ ساتھ حوصلہ مندی اور جرات رندانہ کا اظہار بھی نمایاں ہے ان کے ہاں کہیں کہیں خطیبانہ لہجے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں روحانی تڑپ کے ایسے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہر ذہن اور ہر سطح کے فرد کے لئے ایک نئی تفہیم نئی اشاریت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو موضوعات ہیں ان کو بڑی خوبصورتی سے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے اس مقالے میں سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:''حمیدہ شاہین کی غزل اردو اور فارسی کلاسیکی روایات اور جدید طرز احساس کا خوبصورت امتزاج ہے۔'' (۲۰)

ڈاکٹر رشید امجد اس کتاب کے حوالے سے حوالے لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر نجیبہ عارف کا یہ تنقیدی مجموعہ معاصر ادب کا متنوع مطالعہ ہے جس میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم شاعروں اور نثر نگاروں کا موضوعاتی اور فنی جائزہ لیا گیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تنقید کی پہلی خوبی ان کے واضح خیالات ہیں وہ جو محسوس کرتی ہیں اور جس نتیجے پر پہنچتی ہیں اسے قاری تک منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔''(۲۱)

اس کتاب کا تیسرا حصہ ''نثری ادب'' کے حوالے سے ہے۔ اس حصے میں پہلا مقالہ ممتاز مفتی کا افسانوی ادب معاصر ادبی رجحانات کے تناظر میں ہے۔'' جس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر ممتاز مفتی تک عام حالات کو بیان کیا ہے اور بیسویں صدی میں اردو افسانوی نثر رونما ہوئی اس دور میں لکھنے والے تمام افسانہ نگاروں کا ان کے افسانوں کے ساتھ ذکر کیا ہے ممتاز مفتی کے پہلے دور کی نثر جس حقیقت کی طرف

اشارہ کرتی ہے اس میں ممتاز مفتی نے ان عام لوگوں کی بات کی ہے جن کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطن کچھ اور ان کے بعد منٹو کا ذکر کیا ہے ہم عصر فنکاروں میں ممتاز مفتی کی انسان دوستی کا موازنہ راجندر سنگھ بیدی سے بھی کیا جاتا ہے ممتاز مفتی اپنے کرداروں کی روح میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں ممتاز مفتی کی تحریروں میں ان کی بچپن سے جوانی تک تمام تجربات و مشاہدات کارفرما ہیں اس مقالے میں ممتاز مفتی کے ہر دور میں جو انھوں نے لکھا کیا کہا اور جو تبدیلیاں آتی رہیں وہ سب ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس مقالے میں بیان کیا ہے کہ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری ایک تفصیلی مطالعہ کی حق دار ہے۔

''آب گم'' کے سرچشموں کی تلاش میں یہ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ہے۔ اردو ادب سے تعلق رہنے والا کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا جو اس کتاب سے آشنا نہ ہو اس میں مصنف نے یوسفی کے منفرد انداز تحریر کو سراہا ہے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں کیونکہ یوسفی صاحب ہمارے عہد کے معروف اور انتہائی ہر دلعزیز مصنف ہیں۔ ''آب گم'' اردو نثر کا سرمایہء افتخار اور ادبیات عالیہ کا گزیر جرو ہے۔ آب گم کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں۔

> ''آب گم ایک عجیب و غریب آئینہ ہے مگر یہ خود یوسفی صاحب کے الفاظ میں مسخ آئینہ یا Distorting Mirror نہیں ہے جس میں حسین چہرے الٹے سیدھے نظر آتے ہیں یہ تو وہ آئینہ ہے جس میں ٹوٹے پھوٹے، ڈنگے چبے، آدھے ادھورے، آڑے ترچھے، مسخ چہرے حسین لگتے ہیں اور ان پر ٹوٹ کے پیار آتا ہے''۔(۲۲)

اگلا مقالہ ''سعادت حسن منٹو'' ایک نئی تعبیر ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی اس کتاب میں سبھی اردو ادب کی ایسی ہستیوں کو شامل کیا ہے جو کہ اردو ادب کی پہچان ہیں۔ منٹو بلاشبہ خود ایک ایسا نام ہے جو اردو افسانے کی تاریخ میں چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ منٹو کے بارے میں یہ کتاب پروفیسر فتح محمد ملک کی ہے ''سعادت حسن منٹو'' ایک نئی تعبیر اس کے عنوان کو پڑھ کر جو اندازہ ہوتا ہے وہ بالکل غلط ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ سبھی منٹو کو ایک مخصوص پہلو سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس کتاب کے پیش لفظ سے لے کر اس کتاب کے ضمیمہ جات تک کے بارے میں نجیبہ عارف نے چیدہ چیدہ گفتگو کی ہے۔

''عطاالحق قاسمی کی کالم نگاری'' کے نام سے یہ مقالہ ہے عطاالحق قاسمی جوصحافت کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا یہ مقالہ ان کی کالم نگاری کے حوالے سے ہے کہ ایسے کالم نگار ہیں جن کی زبان وہی عوام کی سیدھی سادی زبان ہے وہ ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیتے ہیں اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی بات پر ڈٹے رہتے ہیں اور ان کے کالموں میں ان کی وطن سے محبت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تشخص کا طالب'' اجمل نیازی یہ مقالہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس مقالے میں اجمل نیازی کی کتاب تشخص جوان کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس پر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی اس کتاب میں معمولی معمولی باتوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ساری کتاب میں سراپا نگاری کی بھی بڑی خوبصورت مثال ملتی ہے اس کو پڑھ کر اجمل کا تحقیقی وتنقیدی انداز غالب نظر آتا ہے۔

''(یہ مقالہ حمید شاہد کی افسانہ نگاری مرگ راز'' کے حوالے سے) کے نام سے موسوم ہے اس میں مصنف نے اس کتاب کے حوالے سے بات کی کہ کتنی کہانیاں ہیں ہر کہانی کا مقصد کیا ہے ہر کہانی کے مقصد کو بڑے احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ ''فاطمہ حسن کی'' کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' فاطمہ حسن کی کتاب آسیب نما چہروں کریدتی ہوئی نظروں، ٹوٹی ہوئی امیدوں اور روکی ہوئی چیخوں کا منظر نامہ ہے اس میں کسی زخمی پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ ہے اس میں کرب بھی ہے بے بسی بھی اور احتجاج بھی ان گم شدہ کہانیوں کو سمجھنے کے لئے پہلے انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے اور پھر محسوس کرنا ہوتا ہے یہ کہانیاں ایک ایسی لڑکی کی نظر کا زاویہ ہے جو شہر ذات میں گم ہوگئی ہے وہ اپنے پاؤں سے لپٹی ہوئی توقعات کی زنجیر سے رہائی چاہتی ہے یہ کتاب اسی شکست کا آئینہ ہے اس میں شدت کا دکھ اور بلا کا رنج ہے اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کہنا ہے۔

> ''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' ان امکانات کی کتاب ہے جو کہانی بن سکتے تھے مگر بن نہیں پائے یہ اس ادھورے سفر کی بات ہے جس میں بھٹکے رہنے کی لذت بھی ہے اور پہنچ نہ پانے کی دل شکن حکایت بھی اس لئے کہ یہ آگاہی اور شناخت کا سفر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا''۔ (۲۳)

اس مجموعے میں جو کہانیاں شامل ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے مصنف کی زندگی میں رونما ہونے والے

واقعات کس طرح ان کی تحریروں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

وحید احمد کا ''زینو'' ایک جائزہ یہ اس کتاب کا آخری مقالہ ہے وحید احمد کا یہ ناول زینو جس میں انہوں نے زندگی کے پھیلاؤ کو ہر طرف سے دیکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس ناول کے ہر پہلو کو دیکھنے کی کوشش کی اور مجموعی طور پر اس ناول کے بارے میں اپنی رائے دی۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

> ''اگرچہ ناول کی فضا پر ایک ان مٹ اداسی، قدرے مایوسی اور قنوطیت کے بادل ضرور چھائے ہوئے ہیں مگر ایک نئے مستقبل کی پیش بینی کسی امید کے دامن سے لپٹی نظر آتی ہے۔۔۔مگر وحید احمد نے ایک نئے آدم کی سائنسی اور مادی توجیہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۲۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیقی مقالات کے حوالے سے ایک کتاب اور منظر عام پر ہے ''ممتاز مفتی شخصیت اور فن'' ان کی اس کتاب میں حقائق کی کھوج کا درست اور منطقی انداز ملتا ہے اس میں انھوں نے ممتاز مفتی کی سوانح نگاری سے لے کر ان کے تمام ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے غیر شخصی انداز میں ممتاز مفتی کے اسلوب سوانح نگاری ان کے احساس و برتری، ان کے خطیبانہ انداز اور ان کے کلام کی واقعیت کو پیش کر کے اس سے استخراج نتائج کا انداز اپنایا ہے سادگی اور صفائی سے مقالے کی شان دوبالا ہوگئی ہے ان کا انداز تحقیق استدلالی ہے سنتیں اور تاریخوں کے ساتھ واقعات ہیں جس سے وہ اصل حقیقت تک پہنچ گئی ہیں یہاں وہ ایک ایسے محقق کا روپ دھار لیتی ہیں جو سچائی کی دریافت اور حقیقت کا کھوج لگانے کے لئے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرتا ہے کسی ایک ذرائع پر اعتماد یا بھروسہ نہیں کرتا یہ ان کے اسلوب تحقیق کی پختگی ہے جو انھوں نے ممتاز مفتی کی شخصیت کو یک جا بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ انھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کی شہادت کے سہارے اپنا فیصلہ بڑی دلیر کے ساتھ پیش کیا۔ افتخار عارف اس کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

> ''ممتاز مفتی اردو فکشن کا ایک بڑا نام ہے انہوں نے افسانہ سوانحی ناول، سفر نامے، شخصی خاکے، ڈرامے اور رپوتاژ میں بیک وقت الگ الگ اسلوب اختیار کرتے ہوئے بالکل جداگانہ شناخت بنائی ان کے اسلوب میں لسانی تجربوں کی نگارنگی انہیں

تمام معاصر لکھنے والوں میں ممتاز مقام پر فائز کرتی ہے۔''(۲۵)

''ممتاز مفتی کی اس فنی عظمت کے پس پشت ان کا مخصوص ذہنی وفکری رویہ کارفرما نظر آتا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے انھوں نے زندگی کو خود اپنی نظر سے دیکھا اور جیسی بھی وہ انھیں نظر آئی اسے ویسا ہی پیش کر دیا۔ اس کتاب میں ممتاز مفتی کی شخصیت، ادبی زندگی، افسانوی مجموعے، خودنوشت، سفرنامے، شخصی خاکے، مضامین، ڈرامے ریڈیائی تحریریں، رپوتاز، تلاش، اعزازات وتاثرات، اور اس مقالے کو مستند بنانے کے لئے حوالہ جات اور کتابیات کو بھی شامل نظر رکھا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحریریں زیادہ تر ممتاز مفتی کے گرد ہی گھومتی ہیں ان کا زیادہ کام بھی ممتاز مفتی کے فن اور فکر کے حوالے سے ہے۔ اور یہی کام ان کی پہچان بنا۔

زیر نظر کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار'' ممتاز مفتی شخصیت اور فن ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آئی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کی تاریخ پیدائش ان کی زندگی کیسے گزری کہاں کہاں گزاری اور کن حالات میں گزاری، ان کی زندگی پر ان کے حالات نے کیا کیا اثرات مرتب کئے؟ اور ان کے والدین کے بارے میں بتایا ہے اور ایسا کون سا خلا تھا جس نے انہوں کو لکھنے کی طرف راغب کیا اور جو ان کی تحریروں میں بھی واضح دکھائی دیتا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں۔

> ''انھوں نے آغاز سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ سماجی رویے سچائی اور حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ان کا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں سچائی سے آنکھیں ملانے کی بجائے توتے کی طرح آنکھیں بند کر لینے کا رواج عام تھا دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت کی عملی تصویر جابجا نظر آتی ہے روز مرہ کی گفتگو میں الفاظ کچھ اور ہوتے ہیں اور مطلب کچھ اور''(۲۶)

نجیبہ عارف نے ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتایا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں پر بات کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کی تحریروں پر متصوفانہ رجحانات کا بھی عکس نظر آتا ہے شخصیت کے بعد ان کی ادبی زندگی کے عنوان کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟ انھوں نے پہلا مضمون کب لکھا؟ کب شائع ہوا؟ اور کب

انھوں نے لکھنے کا با قاعدہ آغاز کیا کتنے افسانوں مجموعے، سوانحی ناول، ڈراما، سفرنامے، شخصی خاکے، مضامین ان سب کو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف ممتاز مفتی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''کسی بھی ادیب کے فنی وفکری ارتقاء کا عمل ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے اور وہ زندگی بھر اپنے افکار وخیالات اور ہیت وتکنیک کے سانچوں میں ردوبدل کرتا رہتا ہے لیکن مجموعی طور پر چند ایسے نمایاں فنی فکری سانچے اس کی شناخت بن جاتے ہیں جن کا اظہار وہ بار بار اپنے قول وفعل یا تحریر وتقریر سے کرتا ہے۔''(۲۷)

اگلا باب ''افسانوی مجموعے'' کے نام سے ہے اس باب میں نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے آٹھ افسانوی مجموعوں کے ساتھ ساتھ ان کی وفات کے بعد جوان کے بیٹے نے بیشتر مسترد شدہ افسانوں کو ترتیب دے کر مجموعے کی شکل میں شائع کیا ان کو فرداً فرداً زیر بحث لائی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہی ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کے جو بھی موضوعات ہیں کس طرح کے موضوعات ان کی تحریروں کا حصہ رہے اور کس کس دور میں ان کی تحریروں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ان کے بارے میں گفتگو کی ہے ممتاز مفتی کے پہلے افسانوی مجموعہ ''ان کہی'' کے بارے میں کہتی ہیں

''ان کہی کی کہانیاں جس دور میں لکھی گئیں وہ عالمی اعتبار سے بحران، کشمکش اور انتشار کا دور تھا اور برصغیر اقتصادی اعتبار سے کساد بازاری اور مندی کی زد میں تھا روس میں ایک خونی انقلاب کے بعد روایتی بادشاہت کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور اشتراکیت کا فلسفہ دنیا بھر کے بڑے بڑے ذہنوں کو شدت سے متاثر کر رہا تھا۔''(۲۸)

اس باب کے ذیلی حصے ہیں جس میں انھوں نے افسانوی مجموعوں اور ان کے اندر موجود افسانوں کے بارے میں مختصر بات کی ہے۔ دوسرے افسانوی مجموعے ''گھما گھمی'' کے بارے میں بھی یہ کہنا ہے کہ اس کے اندر موجود افسانوں کا موضوع نفس انسانی کی پیچیدہ صورت حال کا ادراک واظہار ہے اس افسانوی مجموعے کی کہانیاں قدرے زیادہ الجھاؤ کا شکار ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق کرداروں کا باطنی اضطراب اور بے چینی ایک واضح ناآسودگی اور بے اطمینانی کی آئینہ دار ہے۔

تیسرا مجموعہ ''چپ'' ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اس میں لکھے گئے افسانے ممتاز مفتی کے کٹھن ترین دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''اسمارائیں'' ہے اس افسانوی مجموعے میں شامل کچھ افسانوں کا موضوع فسادات کچھ کا جنس و محبت کی کارفرمائی اور کچھ کا سماجی و معاشرتی مسائل ہیں۔ ''گڑیا رانی'' یہ پانچواں مجموعہ ہے جس دور میں یہ مجموعہ شائع ہوا اس دور میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ممتاز مفتی کی قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی تھی اور اس کے علاوہ ان کا رابطہ مختلف صوفیوں اور درویشوں سے ہوا تھا۔ ''روغنی پتلے'' یہ ممتاز مفتی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اس افسانوی مجموعے کی سب کہانیوں میں ایک ہی موضوع نظر آتا ہے یہ موضوع ''معاشرہ'' ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں۔

> ''فکری اور موضوعی اعتبار سے وہ اس روایت یا طرز حیات کا اثبات چاہتے ہیں جس کی جڑیں اسلامی تہذیب اور سماجی قواعد و ضوابط کے اسلامی تشخص میں پیوست ہیں۔''(۲۹)

''سمے کا بندھن'' ممتاز مفتی کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس افسانوی مجموعے میں شامل ہونے والی تمام کہانیوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے موضوعات پر بھی بات کی ہے اس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں اس کتاب کی پہلی کہانی ممتاز مفتی کی خوبصورت ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ''کہی نہ جائے'' ممتاز مفتی کا آٹھواں اور آخری افسانوی مجموعہ ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے افسانوں کے کرداروں کے بارے میں بات کی ہے اور اپنے ڈھنگ اور خوبصورتی سے افسانے کی کہانیوں کے نتیجے پر پہنچی ہیں۔ جو بلاشبہ ایک محقق اور نقاد ہی کر سکتا ہے۔ ''گڈی کی کہانی'' جو ممتاز مفتی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نے شائع کروایا اس کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ اس مجموعے میں شامل کہانیاں ادھوری ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق: ''مجموعی طور پر اس کتاب میں کوئی ایسا قابل ذکر افسانہ موجود نہیں جو قاری یا نقاد کو شدت سے متاثر کر سکے''۔(۳۰)

''ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری'' ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس میں موضوعات اور رجحانات کے اعتبار سے ممتاز مفتی کی تخلیقی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے کہ ابتدائی دور میں ممتاز مفتی کے فکر و فن کا مرکزی نکتہ انسان کے باطن کا مطالعہ ہے جب کہ دوسرے دور میں ان کی توجہ کا مرکز فرد کے باطن کی بجائے اس کا خارجی ماحول ہے۔ بقول ڈاکٹر

''وہ فرد کے خارج اور باطن کے درمیان رونما ہونے والے تصادم کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں اس طرح ان کا تخلیقی عمل فرد کے نفسی کوائف اور معاشرتی زندگی کے درمیان کوئی ایک نقطہ توازن دریافت کرنے کی سعی مسلسل پر بنیاد رکھتا ہے۔''(۳۱)

زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے ہاں جو تین موضوعات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ موضوعات ان کے ہاں متواتر اور تسلسل سے ملتے ہیں۔

۱۔ معاشرتی تناظر میں فرد کی جنسی رجحانات و جذبات کا تجزیہ اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں جنس کا کردار۔

۲۔ انسانی نفسیات یعنی جنس کے علاوہ دیگر معاملات میں انسان کی نفسی پیچیدگیاں جو اس کے معاشرتی کردار اور رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

۳۔ بیسویں صدی کے برصغیر کی تہذیبی فضا میں قدیم و جدید کے درمیان تصادم اور کشمکش کی صورت حال اور واضح طور پر قدیم کی جدید پر برتری ثابت کرنے کا رویہ اور اسی رویے میں اولاً تصوف اور آخرت میں مذہب کی طرف مراجعت کا رجحان بھی شامل ہے۔

انھوں نے یہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ممتاز مفتی نے عام لوگوں کی بات کی ہے اور ان کے کردار کس قدر الجھن کا شکار نظر آتے ہیں اور کس طرح جنسی جذبہ جب خارجی دباؤ کے باعث دب جاتا ہے چھپ جاتا ہے یا رنگ بدل لیتا ہے تو انسانی شخصیت پر کس کس طرح کے اثرات مرتب کرتا ہے اور ممتاز مفتی کی کہانیاں سماج کو آئینہ دکھاتی ہیں اور یہاں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ممتاز مفتی کی توجہ اور فکری کاوشوں کا مرکز نکتہ محض جنسی نہیں بلکہ انسانی نفسیات ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے انتہائی باریک بینی سے ان کے افسانوں کو دیکھا اور پرکھا ہے ان کے مطابق ان کے افسانوں کے موضوعات تہذیبی آویزش اقدار کی پامالی اور جدید اور قدیم کے تصادم اور ٹکراؤ کی نقش گری ہیں تصوف بھی ان کے آخری تین مجموعوں میں نظر آتا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق یہ ان کا تصوف سے لگاؤ ہی تھا جس وجہ سے ان کی کہانیوں میں انسان اور خدا سے محبت کا تعلق نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے خیال میں مکالمہ ان کے افسانوں کی جان ہے ان کے مکالمے نہ صرف کرداروں کے زبانی و مکانی پس منظر بلکہ ان کی ذہنی و

نفسیاتی فضا سے بھی قریب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے مکالمے ان کی تحریر کو مستقل اور دلکشی کا سامان بنائے رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے چونکہ اپنی اس کتاب کا موضوع ہی ممتاز مفتی شخصیت اور فن رکھا ہے اور اس لئے اس کتاب میں ممتاز مفتی کی پوری زندگی کے بارے میں انھوں نے بات کی ہے تاکہ اگر کوئی عام قاری بھی اس کتاب کو پڑھنا چاہے تو وہ بھی باآسانی ممتاز مفتی کے بارے میں مستفید ہوسکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''امید ہے کہ یہ کتاب عام قاری کو ممتاز مفتی کے فکر و فن سے آشنا ہونے میں مدد دے گی۔'' (۳۲)

اس کتاب میں ''خودنوشت'' کے عنوان سے باب ہے جس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ''علی کا ایلی اور الکھ نگری'' جو ممتاز مفتی کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ہے اس کو شامل کیا ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' کے حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بتایا ہے کہ اس میں اچھے ناول کی تمام خوبیاں موجود ہیں وقعات اور کہانی کے ارتقاء کو بھی اگر دیکھا جائے تو ممتاز مفتی کی زندگی کا ہی تمام نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اس کا موضوع نجی و شخصی زندگی پر سماجی عوامل کا گہرا دباؤ، ماحول اور ورثے کی میکانیت نفسی کیفیات کا خارجی حالات پر غالب آنا اور ذہنی وفکری ارتقاء پر اثر انداز ہونے والے اسباب کا تجزیہ ہیں زیر بحث اس ناول کے موضوع اور فکر کے حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف کا اس کتاب کے باب میں کہنا ہے کہ موضوع کے پھیلاؤ اور فکری گہرائی کے اعتبار سے یہ کتاب عالمگیر ادب میں جگہ حاصل کرنے کے لائق ہے اور اس کے کردار بھی ممتاز مفتی نے جاندار تخلیق کئے ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف سمجھتی ہیں یہ ناول اپنے اندر اتنی زیادہ گہرائی اور وسعت لئے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر ادبی حلقوں نے اس کتاب کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔

''الکھ نگری'' یہ خودنوشت کا دوسرا حصہ ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے الکھ نگری میں موجود ابواب پر روشنی ڈالی ہے ممتاز مفتی نے الکھ نگری کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کتاب کی تخلیق سے ان کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی میں واقعی چوتھی سمت کو دخل حاصل تھا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے یہ بتانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اس کے موضوعات اور واقعات کے تنوع سے دلکشی اور دلچسپی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ''الکھ نگری'' کے ابتدائی

ابواب میں کچھ خوبصورت شخصی خاکے بھی شامل کیے گئے ہیں ممتاز مفتی نے اس کتاب میں وہی کچھ لکھا جو کچھ ان پر بیتا ڈاکٹر نجیبہ عارف نے یہ بات بڑے وثوق اور دلیلیں دے کر ثابت کی ہے کہ ممتاز مفتی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بات کو مستند بنانے کے لئے حوالوں کا بھی ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے ان کے مطابق ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے ممتاز مفتی نے جو کچھ لکھا ہے اس نے ادب اور ادب کے قارئین پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟ اس کتاب کا اگلا باب ''سفر نامے'' کے عنوان سے ہے اس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کا سفر نامہ ''لبیک اور ہند یاترا'' کو شامل کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ''لبیک'' کے بارے میں بتایا ہے کہ لبیک ان کی سفر حج کے دوران کی روداد ہے اور ان کے مطابق

> ''لبیک'' ممتاز مفتی کی سب سے زیادہ تہلکہ خیز اور رجحان ساز کتاب ثابت ہوئی اور اس چنے اردو ادب میں ایک ایسی سنسنی کو جنم دیا جس کی بازگشت دیر تک دنیائے ادب کی فضاؤں میں گونجتی رہی'' (۳۳)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ممتاز مفتی کے پہلے دور کے جو موضوعات تھے اسی وجہ سے ممتاز مفتی کو صرف جنسی، نفسیاتی اور حقیقت نگاری کے موضوعات کا ہی ادیب سمجھا جانے لگا تھا لیکن اس سفر نامے کے بعد دنیائے ادب میں تہلکہ مچ گیا اور یہی وجہ ہے کہ لبیک کی اشاعت کے بعد علم، ادب اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں نے ان پر الزامات لگائے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی ان باتوں کو حقیقت کے قریب اور سچ ثابت کرنے کے لئے بہت سے حوالے بھی دیئے ہیں اور بہت سے لوگوں نے جو بھی لکھا اسے ویسے ہی نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق بظاہر یہ کتاب حج کے سفر نامے کی داستان ہے جس کے دوران ممتاز مفتی کو مختلف تجربات سے گزرنا پڑا ہے یہ تجربات محض روحانی اور مافوق الفطرت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہیں بنتے۔ کیونکہ اس نوع کے واقعات کا ذکر ہمیں اپنی معاشرتی زندگی میں ملتا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کی لبیک میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے اپنے خیالات میں پرونے کی بہت خوبصورتی سے کوشش کی ہے۔

''ھند یاترا'' یہ ہندوستان کا سفر نامہ ہے جو ممتاز مفتی نے امیر خسرو کے عرس کی تقریبات میں شرکت کے لئے کیا ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑی باریکی سے تمام حقائق کا جائزہ لیا ہے کہ ان کے ہندوستان سفر کرنے کی وجہ امیر

خسرو کے مزار پر حاضری دینا نہیں تھی بلکہ ہومیوپیتھی کی کتابوں کا حصول تھا اس میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے سفرنامے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی ہے اس سفرنامے میں چونکہ ممتاز مفتی نے بہت سے موضوعات پر اظہار کیا ہے نجیبہ عارف کے مطابق اس کتاب کا موضوع ''پاکستانیت'' ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندو قوم دراصل کس طرح کی قوم ہے اس کے ساتھ ساتھ ممتاز مفتی کی پاکستان اور مسلمانوں کی آپس میں محبت کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں اس میں دوسرا بڑا موضوع تصوف بھی ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس حوالے سے بھی روشنی ڈالی ہے اگلا باب ''شخصی خاکے'' کے عنوان سے ہے اس باب میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ممتاز مفتی کے چار شخصی مجموعے شائع ہوئے تھے اس باب میں چاروں شخصی مجموعوں میں جن جن شخصیتوں کے بارے میں مضامین شامل ہیں ان کے بارے میں بات کی گئی ہے اور ہر شخصی مجموعے میں کتنے کتنے خاکے شامل ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ان خاکوں میں انھوں نے صاحب مضمون کے جہان باطن کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے انھوں نے مضامین میں عام آدمی اور ادیب کے امتیازات پر کھل کر روشنی ڈالی ہے ان کے خاکوں میں صرف صاحب مضمون کے بارے میں ہی نہیں بلکہ انسان کی فطرت اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں فکر انگیز انداز پیش کرتے ہیں اور ممتاز مفتی کی خاکہ نگاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زیر بحث شخصیت کو حقارت یا تمسخر کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

ممتاز مفتی کے مضامین کو بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس کتاب کا حصہ بنایا ہے اس میں سب سے پہلے ''غبارے'' پر بات کی ہے۔ غبارے ممتاز مفتی کا پہلا مضامین کا مجموعہ ہے یہ کب شائع ہوا؟ اس کتاب میں کل کتنے مضامین شامل ہیں؟ ان مضامین کے موضوعات کیا ہیں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن کب شائع ہوا؟ اس کا پہلا مضمون کیا ہے؟ اور اس کتاب میں شامل مضامین کس کے دور میں لکھے گئے مختلف دور میں لکھنے کی وجوہات کیا ہیں اس سب پر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے روشنی ڈالی ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ان کا پہلا مجموعہ جس کے چھ مضامین عورت کے بارے میں ہیں ان کے مطابق عورت کے بارے میں شاید ہی کوئی بات انھوں نے اپنے مضمون کے دائرے سے باہر نکل کر کی ہو۔ اور ان کے ایسے مضمون عورت کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ''رام دین'' یہ ممتاز مفتی کا دوسرا مضامین کا مجموعہ ہے یہ مجموعہ کب شائع ہوا کس

ادارے کے زیراہتمام شائع ہوا یہ مجموعہ کتنے مضامین پر شامل ہیں۔ان مضامین کے کون سے موضوعات ہیں اس کے بارے میں بیان کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ان کے یہ مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان مضامین کے ذریعے ممتاز مفتی نے اپنے خصوصی مسلک کی مکمل وضاحت پیش کی ہے ان کا خصوصی مسلک ''پاکستانیت'' ہے اوراس کے علاوہ اس مجموعے میں کچھ مضامین میں انھوں نے ادیب کے مسائل اوراس کے دکھ بیان کیے ہیں۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''ممتاز مفتی کے یہ مضامین ان کے ذہنی وفکری ارتقاء کو سمجھنے کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔''(۳۴)

''ڈرامے''ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے ڈراموں کو بھی اپنی کتاب کا حصہ بنایا اورانھوں نے بتایا کہ پہلا ڈرامہ ۱۹۵۲ء میں نظام سقہ'' کے حوالے سے ممتاز مفتی نے سٹیج ڈرامہ تحریر کیا تھا یہ ان کا بہت مشہور تاریخی کھیل کئی بار سٹیج کی زینت بنا۔اس میں ڈرامے کے کردار کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے ممتاز مفتی کے مکالمے ان کے فکری زاویوں کی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جا بجا نظام سقہ کے مکالماتی ٹکڑے مصنف کے مخصوص انداز فکر کو نمایاں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اوراس ڈرامے کا موضوع معاشرتی اقدار و روایات کی پاسداری اور ان کے اثرات پر بنیاد رکھتا ہے۔

ریڈیائی تحریریں: کیونکہ ممتاز مفتی نے ریڈیو کے لئے بے شمار مسودات لکھے جن میں ڈرامے اور مختلف پروگراموں کے سکرپٹ بھی شامل ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے سو سے زیادہ ریڈیائی ڈرامے ملے جنہیں ڈاکٹر ابدال بیلا اشاعت کے لئے لے گئے تھے نجیبہ عارف کے مطابق ممتاز مفتی اپنی اس ریڈیائی مسودات کو اپنی ادبی تخلیقات میں شامل نہیں کرتے تھے۔

رپوتاژ:''تلاش'' یہ ممتاز مفتی کی آخری کتاب ہے جو کہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ''تلاش'' ممتاز مفتی کی نوے سالہ زندگی کے افکار ونظریات کا نچوڑ پیش کرتی ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کی اس کتاب سے وابستگی کو ان کے واقعات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے خیال کے مطابق جب ممتاز مفتی نے تلاش کی قسطیں لکھنا شروع کیں تو ہر ملنے والے کو پڑھنے کے لئے دیتے اوراس سے رائے لیتے۔اس

کتاب کا دیباچہ پنجابی شاعرہ بشریٰ اعجاز نے لکھا کیونکہ ممتاز مفتی کے خیال میں یہ کتاب نوجوانوں کے لئے لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اوران کے اسلوب کو پرکھنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا یہ کتاب لکھنے کا مقصد کیا تھا اور یہ کتاب کیوں لکھی گئی۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس کتاب کے ہر باب کو ذیلی سرخیوں کے ساتھ لکھ کر ان ابواب کے اندر موجود ممتاز مفتی کے خیالات کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں۔

> ''تلاش پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا بنیادی مقصد انسانیت کو قرآن مجید کی عظمت اور انفرادیت کی جانب متوجہ کرنا ہے تا کہ وہ اس الہامی دانش کے ذخائر سے رجوع کر سکے جو دینی و دنیاوی تمام ادوار کے لئے رہنمائی کا ذریعہ ہے۔'' (۳۵)

''اعزازات وتاثرات'' ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان کو بھی عنوان کے ساتھ شامل کیا ہے کیونکہ ممتاز مفتی کا اردو ادب میں اہم مقام اور نام ہے اور ممتاز مفتی نے اپنے عہد پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو اپنی زندگی میں ہی ایوارڈز اور امتیازی نشان عطا ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان کو ملنے والے تمام ایوارڈز اور امتیازی نشان اور ان کو ملنے والے انعاموں کا بھی ذکر کیا ہے ان کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کے بارے میں مصنفوں کی رائے اور کتابوں کے ناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان نقادوں اور ہم عصروں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے شاندار الفاظ میں ممتاز مفتی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں حوالہ جات ممتاز مفتی کی تصانیف معاون کتب، مقالات ومضامین، مسودات وقلمی نسخے بھی شامل کیے گئے ہیں جن سب کی بدولت یہ کتاب ایسی کتاب ابھر کر سامنے آئی ہے کہ قارئین کے لئے ایک چمکتے ہوئے ستارے سے کم نہیں اور ایک ہی کتاب میں ممتاز مفتی جیسی شخصیت کو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس میں سمو دیا ہے اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تیسری تصنیف ''بکل دے وچ چور'' ہے یہ انتخاب وتجزیہ کی کتاب ہے جو جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں ۱۹ افسانے شامل کئے گئے ہیں جو ممتاز مفتی کے تصوف کے حوالے سے ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان افسانوں کو تصوف کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے تعارف و تجزیہ میں نجیبہ عارف نے ممتاز مفتی کے افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے

> ''ان کے افسانوں میں ایک تدریجی ارتقاء نظر آتا ہے یعنی ابتداء میں انھوں نے جنس ،نفسیات اور معاشرتی و تہذیبی اقدار کا اپنے فن موضوع بنایا پھر ان کی توجہ روحانیت کی طرف مبذول ہوگئی اور انھوں نے تصوف سے دلچسپی کا اظہار کیا اور تیسرے مرحلے پر یہ دلچسپی قرآنی مطالعے میں بدل گئی اور وہ تصوف سے آگے بڑھ کر شریعت اسلامیہ کے وکیل بن گئے یہاں ان کی زندگی کا سفر ختم ہوگیا ورنہ وہ اس موضوع پر اپنی کتاب تلاش کے بعد بھی کچھ لکھتے تو ان کے خیالات سے زیادہ واضح طور پر شناسائی ہوسکتی''۔(۳۶)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ان کے ایسے افسانوں کا انتخاب کیا جو تصوف سے متعلق ہوں اور انھوں نے اپنی ہی بنائی ہوئی زبانی تقسیم کے مطابق سب سے پہلے ان کے چھٹے افسانوی مجموعے روغنی پتلے سے افسانے منتخب کیے اور آخری مجموعے کہی نہ جائے'' تک مطالعہ کر کے ایسے افسانے نکالے جنھیں انھوں نے 'متصوفانہ' افسانوں کی ذیل میں رکھا۔ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اگر چہ یہ افسانے اس بنیاد پر منتخب کیے کہ ان میں کوئی نہ کوئی ظاہری صوفیانہ علامت یا واضح صوفیانہ نظریہ پایا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ہی انھوں نے افسانوں میں تصوف کی جھلک بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔اس کتاب میں پہلا افسانہ 'آپا' ہے ممتاز مفتی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ان کہی' ۱۹۴۳ء میں لاہور سے شائع ہوا اس مجموعے میں یہ پہلا افسانہ ہے یہ ممتاز مفتی کے نمائندہ افسانوں میں سے ایک ہے 'آپا' کا موضوع ایک خاموش طبع اور شرمیلی لڑکی کا ہے، سجادہ کی جذباتی کیفیت کا بیان ہے اور اسی کے ذریعے مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کا اصل لطف اور مزا بھڑک کر جلنے میں نہیں بلکہ سوز دل کی ہلکی ہلکی آنچ میں پگھلنے میں ہے سجادہ کے کردار کی قلبی کیفیات اور غم کی واردات کو بیان کر کے انھوں نے اسے محض ہمدردی کے لائق نہیں گردانا بلکہ اس کی بے زبان اور بے طلب محبت کی جیت کا اعلان کر کے اپنی ترجیحات کا اظہار کیا ہے یہ کہانی محض ایک کردار نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

> ''آپا دراصل زندگی بسر کرنے کے جس قرینے کی نمائندہ ہے وہی تصوف کا مطمع نظر

ہے وہ زندگی سے ضد نہیں کرتی اصرار نہیں کرتی انتقام نہیں لیتی اس کی سرشت میں
صبر، برداشت، تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی کا جوہر ہے وہ برملا اظہار اور اعلان کی
قائل نہیں۔ اس کے اندر کی تپش اس کے ظاہر سے نہیں جھلکتی جلے ہوئے اپلے کی
طرح بظاہر وہ بجھ چکا ہے۔ مگر اس کے اندر کی آگ زندہ ہے وہ جلوت کی نہیں خلوت
کی منتظر ہے اس میں پیش قدمی اور چھیننے جھپٹنے کی صلاحیت نہیں بلکہ خاموشی سے منتظر
رہنے کا حوصلہ ہے۔ یہ محض ایک محبت کرنے والی عورت کی تصویر نہیں ایک صوفی ایک
عارف کا رویہ ہے۔(۳۷)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے واضح طور پر انھی افسانوں کو اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ جس میں واضح طور پر متصوفانہ رجحانات کا عکس دکھائی دیتا ہے اس کتاب میں انھوں نے دوسرا افسانہ ممتاز مفتی کے تیسرے مجموعے چپ سے شامل کیا ہے یہ مجموعہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے پہلے شائع ہوا ''پریم نگر'' اس افسانے کی فضا انتہائی خوبصورت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اداسی بھی چھائی ہوئی ہے پریم نگر کا موسم مسلسل ہجر اور جدائی کا موسم تھا یہاں مسرت اور خوشی کا تعلق پا لینے سے نہیں پانے کی آرزو سے ہے وصال اور کامیابی آرزو کی موت ہے اور آرزو اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک وہ تشنۂ تکمیل اپنے حسن زیست طلب اور تمنا سے عبادت ہے محبت کا مزا اور لطف تمام دوامی ہجر سے وابستہ ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف اس افسانے کے بارے میں کہتی ہیں۔

''اس افسانے میں ممتاز مفتی نے مناظر فطرت کی مدد سے بیانیے کے تاثر کو گہرا
کرنے کا کام لیا ہے یہ ان کا ایک نمایاں فنی حربہ ہے مناظر فطرت کے پس منظر کے
ذریعے وہ نہ صرف اپنے معانی کی ترسیل و تبلیغ کا کام لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات
افسانے کے موضوع سے بالکل متضاد کیفیات کو جنم دے کر اس میں سہ البعادی
گہرائی پیدا کر دیتے ہیں۔''(۳۸)

''دودھیا سویرا'' یہ افسانہ ''گڑیا گھر'' افسانوی مجموعے سے ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کا کہنا ہے۔ اس افسانے کو پورے اعتماد کے ساتھ متصوفانہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے یہ حقیقت کو ایک نظریے کی صورت میں پیش کرتا ہے کہ مکانی

صورت حال انسانی اعمال وافعال پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے،فنی وفکری اعتبار سے یہ ایک خوبصورت تخلیق ہے جس کہ حقیقت سے اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن فنی مہارت اور خیال انگیزی کے سحر سے انکار کرنا سہل نہیں اگر دیکھا جائے تو اس افسانے کا مرکزی کردار بہت چونکا دینے والا ہے۔اس افسانے کے تفہیم کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں۔

''دراصل ابہام واسرار کہانی کی تفہیم کا بنیادی جزو ہے۔ممتاز مفتی کی زندگی کی اصل حقیقت جسے حقیقت واحدہ بھی کہا جاسکتا ہے کے بارے میں انسانی اعتقادات اور اس کے ظن وتخمین کی یزنگی کا بیان کرتے ہیں۔ ہر ایک خود اپنے نقطہ ءنظر کو قطعی اور حتمی سمجھتا ہے لیکن جب وہ ''قبرستان'' یعنی آخری منزل پر پہنچتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت تو ایک ہے کائنات کی یہ تمام یزنگی اور تنوع ایک ذات واحد میں ضم ہوجاتے ہیں اور ایک نیا عرفان جنم لیتا ہے۔''(۳۹)

اس کتاب میں اگلے افسانے ''روغنی پتلے'' جو ممتاز مفتی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے اس میں سے لیے گئے ہیں وہ 'بت' دیوتا اور سناٹا'' اور 'آن پورنی' ہیں یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا یہ انیس برس کے وقفے کے بعد منظر عام پر آیا تھا۔''روغنی پتلے' 'افسانوی مجموعے کے بارے میں نجیبہ عارف کا خیال ہے کہ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے افکار پر روحانیت کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے اور ''روغنی پتلے' ' کی اشاعت سے ان کے افسانوی ادب کی متصوفانہ جہت کھل کر سامنے آتی ہے۔اور ایسا لگتا ہے کہ اپنے فنی وفکری ارتقاء کے اس مرحلے پر ممتاز مفتی نے ادب کو اپنے پیغام کی ترسیل کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔'روغنی پتلے' دراصل ان کے پہلے مجموعے ''ان کہی' ' میں شامل افسانے کا اندھیرا ہی اس کا توسیعی روپ ہے ممتاز مفتی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب جملوں کی ساخت اور الفاظ کے دروبست سے کہانی کی مجموعی فضا میں تازگی ،زندگی اور حرکت پیدا کردیتے ہیں فعل حال کا استعمال ایک طرح سے جاری عمل کی نشان دہی کرتا ہے اور فعل ماضی کے ذریعے ایک قصے کے رونما ہو کر ختم ہوجانے کی طرف اشارہ ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

''یہ افسانہ نہ صرف ممتاز مفتی کی فکری وروحانی ترجیحات کا اظہار کرتا ہے بلکہ غیر

شعوری طور پر پاکستانی معاشرے کی عمومی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا بھی مبصر ہے''۔(۴۰)

اسی مجموعے کے تین اور افسانوں 'وہ' 'بت' دیوتا اور سناٹا' میں بھی ممتاز مفتی کے فن کی روحانی یا متصوفانہ جہت نمایاں ہوتی ہے۔ان کے افسانہ''وہ''ایک فرد کے کائنات کی عظیم ترین تخلیقی طاقت سے رشتہ استوار ہونے کی داستان ہے جو اس سے پہلے نہ صرف اس طاقت کی عظمت اور قوت سے ناواقف تھا بلکہ ایک نوعیت کی منکرانہ بغاوت کا دعوی دار بھی تھا اس میں ممتاز مفتی کے ذاتی تجربے کی تازگی اور ندرت ہے یہ افسانہ ممتاز مفتی کے فکری نظام کی اہم کڑی ہے اور ان کے روحانی تجربات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔''افسانہ''وہ''عرفانی و وجدانی لمحے کی داستان ہے جسے ممتاز مفتی نے بڑی فن کاری سے پیرڈوکس اور Irony کی مدد سے پیش کیا ہے۔ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

> ''وہ'' بظاہر بالکل سادہ خود کلامی کی تکنیک میں لکھا جانے والا افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن مفتی نے اس میں گہرے فن کارانہ شعور کا مظاہرہ کیا ہے اس افسانے میں پیراڈوکس اور Irony کو فنی حربے کے طور پر منتخب کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ دونوں ادبی حربے اس موضوع کی ماہیت سے گہرے طور پر وابستہ ہیں وحدت الوجودی تجربے مین کثرت کو حقیقت واحد کی صورت میں شناخت کرنا اور پھر اس حقیقت واحدہ کو اس کے بے شمار اور متنوع اظہاری سانچوں میں پہچاننا انسانی عقل کی فریب خوردگی اور خود اپنی ہی طمع کو حقیقت ادبی کی تلاش قرار دینا اور اس پر ناز کرنا یہ موضوعات پیراڈوکس اور Irony کے وسیلوں سے بڑھ کر کسی اور حربے کی مدد سے شاید اتنی شدت سے بیان نہ ہو سکتے کم از کم اس افسانے کی حد تک اس تجربے کو افسانے کی فنی حدود میں بیان کرنے کا یہ بہترین انداز ہے اسی کی بدولت یہ افسانہ، نہ تو کسی صوفی کے احوال کا بیانیہ بنتا ہے اور نہ کسی دیوانے کی طرز (۴۱)

''بت دیوتا اور سناٹا'' یہ افسانہ ایسا افسانہ ہے جس میں ممتاز مفتی نے فنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑی مہارت اور باریک بینی سے ان افسانوں کا مطالعہ کیا ہے اور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس

نتیجے پر پہنچی ہیں کہ اس کتاب میں انھوں نے جتنے بھی افسانے شامل کیے ہیں ان کا کہیں نہ کہیں تصوف سے تعلق ضرور ہے۔ بت دیوتا اور سناٹا'' افسانے کے حوالے سے ان کا کہنا ہے یہ افسانہ جدید انسان کی تہذیبی شکست کی نوحہ گری ہیں اس میں خدا کا تصور روایتی خدا کی تصویر سے بہت مختلف ہے اور اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ اس میں محض نظریاتی اور اعتقادی خوش گمانی نہیں جھلکتی بلکہ اپنی روح پر بیت جانے والے اس نادرہ کار تجربے کے نقش پیوست ہیں جو فرد کا رخ زندگی کے مادی حقائق سے موڑ کر اس کی روحانی وابستگی کا سامان بن جاتا ہے اور اس کہانی میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق قیامت اور حیات اور بعد موت کے مذہبی تصورات کو انسانی نفس کی عیاری اور مکر و فریب کا راز فاش کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ جبر و شر کا حکم ظاہری اعمال پر لاگو ہوتا ہے لیکن جزا و سزا کا تعلق باطنی اعمال سے ہوتا ہے یوں تو یہ خیال مذہب کی روح بھی ہے لیکن تصوف میں خاص طور پر اس بات کو اہمیت دی جاتی ہے کہ انسانی اعمال اس کی نیت اور ارادے سے اعتبا پاتے ہیں۔

''ان پورنی'' اس افسانے کو بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے اور اس افسانے کو بھی بہترین افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق یہ جسم کے تقاضوں سے روح کی پکار تک کا سفر ہے یہ ایسے ادھورے پن کی کہانی ہے جس میں ادھورے پن کا احساس ایک کانٹے کی طرح چبھا رہتا ہے اور اس کی تکمیل کی خواہش اور تلاش اسے مضطرب و بے قرار کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اس افسانے کا بنیادی خیال یہ ہے۔

> ''فن سے رشتہ استوار ہو جائے اور فنی کمال کی تلاش کا چراغ من میں روشن ہو جائے تو زندگی کو ایک سمت اور جہت مل جاتی ہے وجودی اور مجازی محبتیں فن سے رشتہ استوار کرنے کی راہ ہموار کر دیتی ہیں اور فن مجاز سے حقیقت تک کا سفر کروا دیتا ہے اور یوں عرفان اور ادراک کا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اور یہی افسانے کا مرکزی خیال ہے۔'' (۴۲)

اس کتاب میں شامل پانچ افسانے ایک ہی افسانوی مجموعے سمے کا بندھن سے لئے گئے ہیں یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا'' سمے کا بندھن'' ایک ہاتھ کی تالی' سیڑھی سرکار'' گرداس'' داس گرو' عینی اور عفریت' ان

افسانوں میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے روحانیت اور تصوف کو دیکھ کر ان کہانیوں کے مرکزی خیال بھی بتانے کی کوشش کی تحقیق وتنقید میں ان کا یہ اندازہ انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے'' ۔ ''سمے کا بندھن'' اگر چہ یہ ممتاز مفتی کی خوبصورت کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق یہ ان کی ''ان پورنی'' کی تکمیل تمثیل ہے مجاز سے حقیقت تک سفر جوفن کے سہارے سپھل ہوجاتا ہے سنہری بی بی جواس کہانی میں سر یعنی فن کی علامت ہے مجاز سے حقیقت تک کا سفر اس کا رہنما ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ممتاز مفتی نے اس خاص تھیم کے اظہار کے لئے ہندی دیو مالائی تناظر اور طوائف کے کردار کا بار بار سہارا لیا ہے اور ان کے دوسرے افسانے ''سیڑھی سرکار'' میں بھی مجاز سے حقیقت تک کا سفر بیان کیا ہے۔ان کے مطابق وجود کی کثافت سے نکل کر روح کی لطافت پالینے کے لیے نفس کو ذلت اور پامالی کا امتحان دینا پڑتا ہے۔اور انسان کا نفس ہی اسے خود پسندی اور انا کی تسکین پر اکساتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب ایک بار بے غرضی اور نفش کشی کی منزل سر ہو جائے تو زندگی میں ہی نہیں،مرنے کے بعد،اس کی خاک میں بھی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔افسانہ ایک ہاتھ کی تالی گو کہ یہ بھی ممتاز مفتی کے تصوفانہ رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اس میں محبت میں اپنی انا کو قربان کر کے امر ہو جانے کا موضوع چھڑا گیا ہے۔بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

> ''ایک ہاتھ کی تالی'' کے جمال اور کمال کشتہ عشق ہیں تو ''سیڑھی سرکار'' لذت درد فراق کے اسیر سچی طلب خواہ وہ مجازی محبوب ہی کی کیوں نہ ہو ایسی منزل پر لے جاتی ہے کہ انسان بالآخر محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کا دل کسی اور بے نیاز سے جا اٹکتا ہے۔''(۴۳)

''گرداس داس گرو'' میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق وہ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کا قدرے سکون اور اطمینان سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اس میں انھوں نے ایک انوکھا خیال پیش کیا ہے ان کے خیال میں تصوف میں گرو اور بالکے یا مرشد اور طالب کا رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور یہ تعلق کامل اطاعت اور تسلیم وسر دگی کا طالب ہے۔عینی اور عفریت یہ افسانہ ممتاز مفتی کے فنی ارتقاء کا اہم موڑ ہے۔اور اس کہانی میں نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں زندگی کے ڈھلکتے ہوئے بہر کی کیفیات کو الفاظ کے آئینے میں تصویر کیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کہانی کے اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ عرفان ذات انسان کو اس کے اندیشوں اور فکروں سے آزاد کر دیتا ہے اور یہی اس کا مقصود حیات بھی ہے

اور ایک پورٹریٹ کی مدد سے اس تحریری حقیقت کو حسی تجربے کے طور پر بیان کر کے ممتاز مفتی نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔اس کتاب کے آخری سات افسانے ممتاز مفتی کے آٹھواں اور آخری افسانہ مجموعہ ''کہی نہ جائے'' سے لئے گئے ہیں یہ مجموعہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا یہ افسانہ معروف فارانی ''دیکھن دکھن'' ''پھیلاؤ کی زیرلبی' 'اور'' چوہا'' انسان کی خودآ گاہی کی تمنا اور اس راہ میں درپیش خطروں دھوکوں اور واہموں سے متعلق ہے۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف

> ''معروف فارانی میں یہ حقیقت بتائی گئی ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی ذات کی وحدت میں بھی کثرت کا روگ پال لیتا ہے اس میں دو دلی پیدا ہو جاتی ہے وہ چاہتا کچھ اور ہے کرتا کچھ اور ہے اس کی توانائیاں منتشر ہو جاتی ہیں اس کی ذات بٹ کر رہ جاتی ہے اس افسانے کی بنت کمزور ہے اور پلاٹ کی تعمیر میں ممتاز مفتی کی گرفت ڈھیلی معلوم ہوتی ہے کہانی مکالموں کے ذریعے آگے بڑھنے کی بجائے بکھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جیسے موضوع کا انتشار اس کی ہیت پر بھی اثر انداز ہو گیا ہے۔'' (۴۴)

دیکھن دکھن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اس میں کائنات کی یہ زندگی کو ایک پردہ کہا گیا ہے جو ذات واحد نے خود پر اوڑھ لیا ہے اگر کوئی پردہ اٹھا دے تو پھر باقی کچھ نہیں رہتا، نہ دکھ نہ سکھ، نہ روشنی نہ اندھیرا، کثرت کا کھیل ختم ہو جاتا ہے اور وحدت بے کرانی رہ جاتی ہے۔''چوہا'' کا بنیادی خیال بھی توجہ کا مرکز تلاش کرنے کی اہمیت ہے اگر انسان اپنی 'میں' کو تیاگ کر اپنی توجہ کا مرکز اپنی ذات سے باہر تلاش کر لے تو اسے اپنی ہستی کا اثبات حاصل ہو سکتا ہے۔''پھیلاؤ کی زیرلبی'' افسانے میں مکانی تاثرات کا انسانی جذبے پر گہرا اثر ثابت کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔اگلا افسانہ ''بوتل کا کاگ'' جو اگر دیکھا جائے تو استعاراتی اہمیت کا حامل افسانہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مصنوعی رکھ رکھاؤ اور نمائشی ظاہر نے فرد کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔اور وہ اذیت کا شکار ہو کر اذیت میں مبتلا ہے ایسے میں اسے وجدار اور مستی کے اس لمحے کی تلاش ہے جس میں وہ 'میں' سے 'تو' کا رخ اختیار کر لے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> ''کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ صوفیانہ وجد و مستی کی واردات کے دوران کسی ایک

فرد کی قلبی حالت، اس کے اردگرد موجود لوگوں کے قلوب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور ایک انفرادی جذبے کی شدت اجتماعی حال بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ مزاروں پر قوالیوں اور صوفیانہ مستی کے دیوانہ وار رقص کے دوران، وہاں موجود دیگر افراد کے دل و دماغ بھی اس چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر بھی وہی سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو انھیں نفس کی سطح سے اوپر اٹھا کر لطیف ترین سطح وجود تک لے جاتی ہے۔'' (۴۵)

افسانہ ''ممتا کا بھید'' ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اگر چہ یہ افسانہ عورت کی عظمت اور معاشرتی مقام کی عکاسی کرتا ہے یہ کہانی بھی علامتی کہانی کی طرح نظر آتی ہے اس کتاب کا آخری افسانہ ''کہانی کی تلاش'' ہے اس میں کہانی کار راو ر نقاد کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہانی کار کا نظریہ فن معلوم ہوتا ہے جو اس کی ذات کی توسیع کر کے اسے اپنی بات سے زیادہ دوسروں کی بات کہنے پر اکساتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے خیال میں ''میں'' کو پانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ 'تو' سے گزرتا ہے اگر دیکھا جائے تو بظاہر یہ الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ ''تو کا عرفان ''میں'' کی پہچان سے مشروط ہے لیکن درحقیقت یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں۔

> ''ان کے افسانوی ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا فن ان کے ذاتی تجربات اور سوانح سے شدت سے متاثر ہوتا ہے ممتاز مفتی نے جب بھی کوئی کہانی لکھی ہے وہ ان کے اس دور کی ذہنی کیفیت سوچ اور جذباتی حالت کی ترجمان رہی ہے اس بات کا اندازہ نہ صرف ان کی خودنوشت پڑھ کر ہوتا ہے بلکہ ان کے ذاتی روزنامچے بھی اس کے گواہ ہیں۔ (۴۶)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے جس جانفشانی اور محنت، لگن سے ان افسانوں کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اس کی جا بجا ہمیں مثالیں نظر آتی ہیں کہ انھوں نے کیسے اور کس طرح سے ممتاز مفتی کے افسانوں کو پرکھنے اور ان میں تصوف کی جھلک دیکھنے اور ان میں تصوف کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں اپنے نظریے سے بھی

آ گاہ کیا بلا شبہ یہ ایک محقق ونقاد کے علاوہ کسی عام قاری کے بس کی بات نہیں۔

تحقیق وتنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے عام طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے کے متضاد سمجھا جاتا ہے جب تحقیق سے بے خبری اور بے تعلقی اختیار کی جائے تو تنقید خود بخود دقیق اور غیر مستند ہو جاتی ہے تنقید کے بغیر تحقیق نامکمل ہے تحقیق کا کام تنقید کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے اگر تنقید کی بنیاد تحقیق پر ہو دونوں کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ محقق ونقاد کے لیے ضروری ہے کہ تعصّبات سے بچتے ہوئے اپنی بات کو توازن اور تناسب سے پیش کرے اور بے جا مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے حقائق منظر عام پر لائے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔''ایک خاص حد تک تنقید وتحقیق نے دائرہ ہائے عمل الگ الگ ہیں مگر ایسے دائرے بھی ہیں جن میں یہ دونوں ہم قدم اور ہم رکاب ہیں''(۴۷)

ڈاکٹر نجیبہ عارف گو کہ ایک بڑا نام ہے اور ادبی حلقوں میں ان کی پہچان بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے یہ ایسی محقق ونقاد ہیں کہ ان کی تحریروں میں موضوع سے گہری وابستگی اور بات کی تہہ تک پہنچنے میں محنت اور کاوش جھلکتی ہے ان کی تنقید وتحقیق کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اس موضوع سے متعلق سارا مواد اچھی طرح گھنگالتی ہیں اور دستیاب ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے نتائج کو مستند حوالوں سے سادہ ادبی اسلوب میں پیش کرتی ہیں وہ تحریر کو عالمانہ الفاظ کے استعمال سے بوجھل نہیں ہونے دیتی یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت عام فہم اور رواں ہوتی ہے۔ الغرض ڈاکٹر نجیبہ عارف کے تحقیقی وتنقیدی سرمایہ کتب ومقالات کی بنیاد پر ہم اپنے سرمایہ علمی میں معنی خیز اور نتیجہ خیز اضافہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کمال سنجیدگی اور عرق ریزی کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر نہایت کامیابی سے روشنی ڈالی ہے انھوں نے پہلے سے قائم شدہ مفروضات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنی تحقیق وتنقید کو بامعنی بنایا نجیبہ عارف کی ہر تحریر میں مواد کی تلاش سے لے کر نکتہ آفرینی کی منزل تک غیر جذباتیت اور غیر جانبداری کا وصف نمایاں نظر آتا ہے وہ دھیمے انداز میں بحث وتمحیص کی قائل ہیں اس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں روانی اور گہری پیچیدگی پائی جاتی ہے انھوں نے تحقیق وتنقید میں بحث سے اجتناب کرتے ہوئے نہایت محتاط انداز اختیار کیا ہے ان کی تحقیق وتنقید سے ان کے مزاج اور اسلوب کی صحیح تفہیم ہوتی ہے ان کی تحریروں میں ندرت، ایمان داری، ذہانت اور تحقیقی وتنقیدی طریقہ کار کے وصف نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے جو بھی

تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تحقیقی کتب سامنے آئی ہیں وہ فکری زاویوں کے حوالے سے اپنی پہچان آپ ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ نے جس بھی موضوع پر قلم اٹھایا ہے انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں اٹھایا ہے اور جو بھی رائے قائم کی اس پر ہمیشہ قائم رہیں انھوں نے ہمیشہ ادباء سے اچھا ادب تخلیق کرنے کی امید رکھی سب سے بڑی بات ان کا اسلوب تنقیدی و تحقیقی ہے جو ہر قسم کی محدودیت سے پاک شستہ، رواں اور سہل ہے ادب کی تفہیم سے ترسیل کا سلیقہ کوئی ڈاکٹر صاحبہ سے سیکھے انھوں نے کبھی بھی کسی تحریک یا رجحان کی پاسداری نہیں کی بلکہ ہمیشہ تنقید و تحقیق کے ضمن میں کھرا، سچا اور ادب کے تقاضوں کے مطابق طریقہ اپنایا انھوں نے جو بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فتح محمد ملک (فلیپ)، رفتہ وآئندہ، نجیبہ عارف، ''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۱۰

۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''رفتہ وآئندہ'' پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۱۳

۳۔ ایضاً، ص۲۰

۴۔ ایضاً، ص۲۶

۵۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۱۳

۶۔ ایضاً، ص۳۴

۷۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۸۴

۸۔ ایضاً، ص۶۲

۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۳۷

۱۰۔ ایضاً، ص۹۲

۱۱۔ ایضاً، ص۹۸

۱۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص۱۰۲

۱۳۔ ایضاً، ص۱۱۱-۱۱۰

۱۴۔ ایضاً، ص۱۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص۱۳۴-۱۳۳

۱۶ ایضاً، ص۱۳۴

۱۷۔ ایضاً، ص۱۵۷

۱۸۔ ایضاً، ص۱۶۸

۱۹۔ ایضاً،ص۱۶۹

۲۰۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی،اسلام آباد،جنوری۲۰۰۸ء،ص۱۷۵

۲۱۔ رشید امجد(فلیپ)''ممتاز مفتی شخصیت اورفن''از،نجیبہ عارف،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء، ص،۱۲۷

۲۲۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''رفتہ وآئندہ''پورب اکادمی،اسلام آباد،جنوری۲۰۰۸ء،ص۲۲۱

۲۳۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''رفتہ وآئندہ''، پورب اکادمی،اسلام آباد،جنوری۲۰۰۸ء،ص۲۶۱

۲۴۔ ایضاً،ص۲۷۰

۲۵۔ افتخار عارف(فلیپ)'' ممتاز مفتی شخصیت اورفن'' از،نجیبہ عارف ،اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء،ص۷

۲۶۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''ممتاز مفتی شخصیت اورفن''،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء،ص۹

۲۷۔ ایضاً،ص۲۵

۲۸۔ ایضاً،ص۴۴

۲۹۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''ممتاز مفتی شخصیت اورفن''،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء،ص۴۵

۳۰۔ ایضاً،ص۶۸

۳۱۔ ایضاً،ص۸۵

۳۲۔ ایضاً،ص۸۵

۳۳۔ ایضاً،ص۸

۳۴۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''ممتاز مفتی شخصیت اورفن''،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷ء،ص۱۰۷

۳۵۔ ایضاً،ص۱۴۰

۳۶۔ ایضاً،ص۱۵۲

۳۷۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''بکل دے وچ چور''،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۱۲ء،ص۲۲

۳۸۔ ایضاً،ص۲۳

۳۹۔ ایضاً،ص۲۵

۴۰۔ ایضاً،ص۲۹-۲۸

۴۱۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''بکل دے وچ چور''،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۱۲ء،ص۳۳

۴۲۔ ایضاً،ص۳۵

۴۳۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''بکل دے وچ چور''،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۱۲ء،ص۴۰

۴۴۔ ایضاً،ص۴۱

۴۵۔ ایضاً،ص۴۲

۴۶۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،''بکل دے وچ چور''،الفیصل ناشران لاہور،۲۰۱۲ء،ص۴۳

۴۷۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر،مباحث،مجلس ترقی اردو لاہور۱۹۶۵ء،ص۳۶۶

باب چہارم

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحیثیت مترجم و مدیر

ترجمہ:

اردو میں ترجمہ کا لفظ انگریزی زبان کے لفظ Translation کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹرانسلیشن اور ترجمہ دونوں کے مفہوم کی وضاحت مظفر علی سید نے ان الفاظ میں کی ہے۔

> ''ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں (پار لے جانا) اس سے قطع نظر کے کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل مکانی تک پھیلا ہوا ہے اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے یہ عربی زبان سے آیا ہے اہل لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر وتعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان احوال یا تذکرہ شخصی ہے یا سب معانی باہم مربوط ہیں''۔(۱)

ترجمہ ایک اہم لسانی اور فکری عمل ہے جو ایک طرف علم وادب کی حدود میں وسعت پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف تہذیبوں کے تال میل کا ذریعہ بنتا ہے ترجمہ دوسری دنیا اور ماحول تک رسائی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے ترجمہ کے ذریعے ایک قوم کا علم، تہذیب، شعور اسالیب دوسری قوم تک پہنچتے ہیں۔ ترجمہ ایک مشکل اور مشقت طلب کام ہے ترجمے میں اکہری صلاحیت کام نہیں آتی بلکہ اس کے لئے دوہری صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ دونوں زبانوں کے مزاج اور روایت سے واقف ہو۔ یوں تو واقفیت ہر قسم کے ترجمے کے لئے ضروری ہے مگر علمی سائنسی یا دفتری تراجم سے زیادہ ادبی تراجم ان خوبیوں کے بغیر مکمل نہیں یہاں تک کے ترجمہ ایک سطح پر تخلیقی نوعیت کا عمل بن جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک زبان میں ادا ہونے والے خیالات کو دوسری زبان کے لفظی

پیکروں میں اس طور داخل کیا جاتا ہے کہ وہ ان لفظی پیکروں میں پھر سے زندہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ افسانوی تراجم میں ترجمہ کرتے ہوئے ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جملوں کے اہم اور اسلوب کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے لہٰذا:

''افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور اسے بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ آخری اہم بات یہ ہے افسانوی یا ناول کی تہذیبی فضا کے پیش نظر ایسے لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجموں میں پوری فضا کو منتقل کر سکے''۔(۲)

یہ بات درست ہے کہ مترجم کو مختلف تہذیبوں اور مزاجوں کو ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے معانی لفظ، تصویروں اور عبارت کے آہنگ کو دوسری زبان سے ازسرنو پیدا کرنا ہوتا ہے یہ کام اسی صورت انجام پا سکتا ہے۔

''جب مترجم متن میں موجود موضع سے طبعی مناسبت رکھتا ہو اور مصنف سے بھی اس کی نفسیاتی مماثلت ہو اسی طرح سے صنف ادب یا شاخ علم سے بھی واقف ہونا چاہیے جس میں متعلقہ متن موجود ہو''۔(۳)

گویا ترجمہ تخلیقی عمل کی طرح ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے علم، مشاہدے اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مترجم کو تو مصنف کے تخلیقی عمل کو سمجھنا پڑتا ہے۔ اردو میں تراجم کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہی ہو چکا تھا فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفوں نے بلند پایہ اور معیاری ترجمے کیے۔ اردو داستانوں کا ذخیرہ اس کالج اور کالج سے باہر ترجمہ کرنے والوں کی مرہون منت ہے۔ داستانوں کے علاوہ تصوف، مذہب اور تاریخ کے موضوعات سے متعلق عربی، انگریزی اور فارسی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد مغربی ادب کے اثرات کے تحت انگریزی ادب کی اردو میں منتقلی ہوئی اور انگریزی اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

''اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول اور نوٹنکی کی جگہ ڈرامہ اور کہانی کی جگہ افسانے جیسی جدید اصناف نے لے لی اور ادبیات عالم کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا''۔(۴)

دہلی کالج (قیام ۱۸۲۹ء) میں بھی ترجمے کا گراں قدر کام ہوا دہلی کالج میں مجلس ترجمہ ''دہلی ورینکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی جس کے تحت فلسفہ، ریاضی، کیمیا، طبعیات، تاریخ اور حیاتیات وغیرہ متعدد علوم کی کتب اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ کالج کے باہر بھی ترجمہ کا بہت سا کام ہوا شبلی کی ''نیرنگ خیال'' کے بیشتر مضامین انگریزی مضامین کا آزادانہ ترجمہ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کو فن ترجمہ میں مہارت حاصل تھی انھوں نے متعدد سرکاری قوانین اور دفتری ضابطوں کے تراجم کیے۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی ہند قائم ہوئی اس انجمن نے عربی، انگریزی، فارسی اور فرانسیسی زبانوں کی قیمتی اور اہم کتابوں کا ترجمہ کروا کے شائع کروائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے دارالترجمہ نے بھی جدید علوم وفنون سے متعلقہ کتب کے معیاری تراجم پیش کیے مولوی عنایت اللہ دہلوی کو فن ترجمہ میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ترجموں کا ذخیرہ بہت وسیع اردو میں نثر کے تراجم کرنے والوں میں مرزا ہادی رسوا، محمد حسن عسکری، انتظار حسین، بشیر چشتی، انیس خاکی، ابن انشاء، ستار طاہر، مولانا عبدالمجید سالک، سید حسن فاروقی سعادت حسن منٹو، عابد علی عابد، ن م راشد، سجاد ظہیر، مجنون گورکھپوری، عزیز احمد عبداللہ ملک، امتیاز علی تاج، یوسف ظفر، قمر نقوی، نیاز فتح پوری، غلام عباس، سید وقار عظیم اور بہت سے ترجمین شامل ہیں۔

> ''دور جدید میں ل احمد اکبر آبادی اور ظ انصاری نے روسی زبان سے محمد حسن عسکری اور نسیم ہمدانی نے فرانسیسی زبان سے حبیب اشعر دہلوی، محمد احمد پانی پتی اور خلیل احمد حامدی نے عربی سے اور غلام رسول مہر، آباد شاہ پوری، قاسم محمود صلاح الدین محمود، محمد سلیم الرحمٰن، محمد سہیل عمر، وارث سرہندی اور تحسین فراقی نے انگریزی زبان سے عمدہ ترجمے کیئے۔'' (۵)

''تلاش'' اللہ ماورا کا تعین عکسی مفتی نے یہ انگریزی میں کتاب لکھی اور ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بہت خوبصورتی سے ایک مترجم کی حیثیت سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا، اگر دیکھا جائے تو ترجمہ اپنے فنی تقاضوں کے لحاظ سے بہت مشکل کام ہے اصل عبارت کی روح کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ لفظی ترجمہ کا بھی خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ نجیبہ عارف نے بہت محنت اور مہارت سے کتاب کا ترجمہ کیا ہے عکسی مفتی نے جو بھی اپنے

جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے جذبات کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ترجمہ چونکہ دومختلف زبانوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے اس کی لسانی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، مترجم کو سنجیدگی، ذہانت، علم اور دونوں زبانوں پر قدرت ہونی چاہیے اسی طرح مترادفات اور لفظیات کا شعور اور مشق اس کے علمی تنوع کا باعث ہوتا ہے عموماً مترجم لفظوں کے چناؤ پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور انگریزی یا دیگر زبانوں کے تراجم کرتے ہوئے متبادل لفظیات پر خصوصی توجہ دیتا ہے نئے نئے مشتقات وضع کرتا ہے ایسا اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب وہ دونوں زبانوں کی فنی نزاکتوں سے واقف ہو۔عبدالمجید سالک کے بقول

> ''مترجم کے لئے دونوں زبانوں سے خاصی واقفیت ضروری ہے نہ صرف لفظی واقفیت بلکہ انشائی استعداد ضروری ہے ورنہ اصل ترجمے کی روح ترجمہ میں کبھی منتقل نہیں ہوسکے گی۔''(۶)

مولوی عبدالحق کا بھی کہنا ہے

> ''ترجمے میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو مضمون پر حاوی ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں میں کامل دسترس رکھتا ہو ادب کی نزاکتوں سے واقف ہو اور اصل مصنف کے صحیح مفہوم کو اپنی زبان میں اسی قوت سے بیان کر سکے''۔(۷)

ترجمہ نگاری میں عموماً ایک زبان مترجم کی مادری زبان ہوتی ہے اور مترجم اس زبان پر عبور بھی رکھتا ہے ترجمہ نگاری سے کسی زبان میں ٹھہراؤ یکسانیت اور بوجھل پن کی بجائے نئے موضوعات، الفاظ وتراکیب کے اظہار کا نیا سانچہ میسر آجاتا ہے۔حاجی فخر احمد کے بقول: ''علمی تراجم کے ذریعے اقوام اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہیں۔'' (۸) گویا ترجمہ نگاری سے علمی، سائنسی، معلوماتی اور فلسفیانہ ادبی موضوعات پر ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور ابلاغ واظہار میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔تاہم ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو چند باتیں مدنظر رکھنی ہوتی ہیں یعنی ترجمہ حتیٰ الامکان تحت اللفظ ہو اصل عبارت کا خلاصہ نہ ہو ماورا زبان کے مطابق ہو اور ذخیرہ الفاظ میں پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہو۔محمد حسن عسکری نے ترجمے کا نہایت سادہ معیار متعین کیا ہے۔

> ''اردو ترجمے میں بس اتنی سی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست پڑھنے میں لگے

کہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے''۔(۹)

''تلاش اللہ ماورا کا تعین'' یہ عکسی مفتی کی انگریزی کتاب ہے عکسی مفتی نے اس کتاب کو ۱۹۶۹ء میں چارلس یونیورسٹی پراگ میں طالب علمی کے زمانے میں لکھی اور انھوں نے خدا کے سائنسی فریضے کو پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا تھا۔لگاتار اور وقفے وقفے سے کی گئی چالیس سال کی مسلسل تلاش اور تحقیق کے بعد بالاخر اللہ کا سائنسی فریضہ تیار کرلیا گیا جو اس کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔اس کتاب کے بارے میں عکسی مفتی کا کہنا ہے۔

> ''اہل مشرق کا دیرینہ خیال ہے کہ اللہ اتنی عظیم حقیقت ہے کہ سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی اللہ سائنس سے کہیں بڑا ہے اور سائنس میں یہ دم خم نہیں کہ اللہ تک رسائی حاصل کر سکے اس کتاب میں اللہ کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی بے باک جرات کا مظاہرہ کیا گیا ہے اللہ کی یہ سائنس اللہ کے ننانوے ناموں اسمائے حسنیٰ پر مبنی ہے یہ کتاب ممتاز مفتی کی تصنیف ''تلاش'' کی اگلی کڑی ہے۔''(۱۰)

اس کتاب کے بارے میں فریڈ ایلن وولف (المعروف ڈاکٹر کوانٹم) کہتے ہیں۔

> ''عکسی مفتی کی کتاب اللہ ماورا کا تعین نا صرف اپنی دلکش نثر کی وجہ سے دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے بلکہ انہوں نے سائنس اور روحانیت کے باہمی رشتے کو جس فکری گہرائی سے بیان کیا ہے وہ بھی قابل تحسین ہے۔عکسی مفتی نے ان قدیم عربی وعبرانی حروف کی مدد سے جو بیک وقت مقدس اور روزمرہ استعمال کے مفاہیم کے حامل ہیں یہ واضح کیا ہے کہ کائنات کی جدید اور مادی تفسیر وتعبیر کی روحانی معنویت قدیم الہامی متون میں کیسے آشکار ہوتی ہے۔میرا مشورہ ہے کہ سائنس دان اور اسلام مسیحیت اور یہودیت جیسی تمام روحانی روایات کے پیروکار اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔''
>
> (۱۱)

یہ کتاب دراصل ''خدا کی تلاش'' (اللہ کا سائنسی اصول) کے متعلق ہے اگر دیکھا جائے تو خدا کی تلاش صدیوں سے سائنس اور فلسفے کی جستجو کا مرکز رہی ہے اور جدید فلاسفی بھی ایسے ہی کئی مرکزی نکتے کی تلاش میں زندگی

بھر کوشاں رہے تا کہ اس کھوج کی تلاش ممکن ہو سکے۔ ''تلاش اللہ ماورا کا تعین'' اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں خدا کی تلاش (ماورا کا تعین) کا تعارف بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں چار ابواب کو شامل کیا گیا ہے اور جس میں حوالہ جات مصنفین و کتب کا اندراج بھی شامل ہے یہ کتاب ۴۵۷ صفحات پر مشتمل ہے الفیصل ناشران نے اس ترجمہ شدہ کتاب کو شائع کیا۔ عکسی مفتی کی اس کتاب کا ترجمہ کرنا نجیبہ عارف کے لئے بھی ایک انوکھا تجربہ ثابت ہوا ان کے مطابق جب انہوں نے اس کتاب کے ترجمے کی حامی بھری تو ان کے ذہن میں دور دور تک یہ بھی خیال نہ تھا کہ یہ کتاب ان پر کس قدر حاوی ہو جائے گی۔ ترجمہ کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں۔

> ''مجھے ترجمے کے عمل کا محدود سا تجربہ ضرور تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ترجمہ تخلیق سے بھی زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ تخلیق میں تو خود اپنے ہی مد مقابل ہونا پڑتا ہے لیکن ترجمے میں خود اپنے آپ کو رد کرنے، کسی اور ہستی کے تجربات وتصورات کو اپنی جان پر جھیلنا ہوتا ہے یہ سراسر پرائی آگ میں جلنے کا عمل ہے۔''(۱۲)

اس کتاب کا ترجمہ نجیبہ عارف نے عکسی مفتی کی مدد کرنے کے لئے کیا تھا اور ان کے بہت سے سوالات کا جواب بھی ان کو اس کتاب کے پڑھنے سے ملا اس کتاب کے حوالے سے کہتی ہیں:

> ''یہ کتاب الٰہیات کے مباحث پر مبنی ہے نہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق ہے یہ بنیادی طور پر سائنس اور فلسفے کی کتاب ہے جس کا مقصد اللہ کے بارے میں مشرقی نقطہ نظر کو علمی، سیکولر، سائنسی اور مربوط مگر عوامی انداز میں پیش کرتا ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں کیرن آرم سٹرانگ کی THE HISTORY OF GOD اور رچرڈ ڈاکن کی THE GOD DELUSION جیسی کتابوں میں اٹھائے گئے سوالوں پر گفتگو کی گئی ہے۔''(۱۳)

نجیبہ عارف کے مطابق انہوں نے عکسی مفتی کے قلمی نسخے سے اس کتاب کا ترجمہ کیا نجیبہ عارف کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ۲۰۱۲ء میں الفیصل ناشران نے شائع کی اور عکسی مفتی کی انگریزی کتاب جس کا نام ALLAH

MEASURING THE INTEGIBLE SCIENTIFIC AND PHLOSIPHICAL PERSPECTIVE ON THE DIVNE' یہ کتاب بھی الفیصل ناشران نے ۲۰۱۶ء میں شائع کی۔

عکسی مفتی کی یہ کتاب اور نجیبہ عارف کی ترجمہ کی ہوئی کتاب دونوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ہو بہو ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ظاہری ساخت بھی ایک جیسی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کتاب اردو میں ہے اور ایک انگریزی میں۔ یہ کتاب عکسی مفتی نے قدرت اللہ شہاب اور اپنے اباً ممتاز مفتی کے نام کی ہے۔ اس کتاب کی جو ترتیب عکسی مفتی نے دی ہے وہی نجیبہ عارف نے رکھی ہے۔ سائنس کے بارے میں اس کتاب میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سائنس علم کی ایک ایسی شاخ ہے جو قابل ستائش بھی ہے اور قابل تعین بھی اور ہر وہ شے جو قابل پیائش اور قابل تعین ہو انسان کے اختیار میں آسکتی ہے لیکن اللہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ نجیبہ عارف کا کہنا ہے کہ عکسی مفتی کی خواہش کے مطابق اس کتاب کا ترجمہ الفاظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا ہونا چاہیئے اس لئے اس کتاب کا ترجمہ الفاظ کا نہیں مفہوم کا ہے اس کتاب کا متن سائنسی اور فلسفیانہ اصطلاحات سے بھرا پڑا ہے اور اس میں جتنے بھی پیش کردہ تصورات اور نظریات ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ عام فہم انداز میں پیش کیا ہے نجیبہ عارف نے زبان کی تحریری اور تقریری صورتوں میں بھی عام تجربے کو ہی پیش نظر رکھا ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف سیاق وسباق میں مختلف معانی ومفاہیم اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اس کتاب کے ترجمے کے دوران بھی بعض اوقات ایک ہی لفظ کے تناظر کی نسبت ایک سے زیادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن انہوں نے تکنیکی اصطلاحات کی وضاحت کے لئے انگریزی متبادل قوسین میں درج کر دیے ہیں لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے اس کتاب کا حرف بہ حرف خود بھی مطالعہ کیا ہے اور جہاں ضرورت پڑی وہاں اس کی صلاح وترمیم سے بھی کام لیا ہے نجیبہ عارف نے اس قدر جانفشانی سے اس ترجمے کے عمل کو بخوبی انجام تک پہنچایا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے نجیبہ عارف نے بہت سے مقامات پر تحریر کا تاثر برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ایک جگہ عکسی مفتی نے اس طرح تحریر لکھی ہے اور نجیبہ عارف نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

> "The scientific law of Allah is neither an occult. Some kind of eccentric cosmogony. It is here to validate and build upon the cumulative body of our emprical sciences, to knowledge and affirm the

humanistic values of our modern civilization. I am persuaded her to refer to louis rauwels and jacques bergier, the writers of the down of magic".(14)

''اللہ کا سائنسی اصول نہ تو کوئی روحانی ، جادوئی منتر ہے ، نہ کوئی انوکھا اور عجیب و غریب تکوینی نظریہ، یہ تو مجموعی تجربی سائنس کی بنیاد پر قائم کیا گیا کلیہ ہے جو ہماری جدید تہذیبی اقدار کا اثبات ہی نہیں، ان کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ میں یہاں The down of magic نامی کتاب کے مصنفین ،لوئی غوولیز ژاک کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''(۱۵)

ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس کے وسیلے سے کسی بھی زبان کے علمی سرمائے کو دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اگر نجیبہ عارف کی ترجمہ نگاری کے حوالے سے اس کتاب کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کو فن ترجمہ نگاری پر مکمل عبور حاصل ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہی یہی ہے کہ ان کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر مکمل عبو رحاصل ہے اور جہاں تک انگریزی سے اردو میں ترجمے کا تعلق ہے تو انھوں نے ترجمے میں اردو مزاج اور ساتھ ساتھ زبان و بیان کے رس کو بھی پرونے کی کوشش کی ہے ان کا کیا ہوا ترجمہ سلیس ،شستہ ، رفتہ اور صاف ہے۔ انھوں نے نازک سے نازک بات معمولی روزمرہ جہاں تک ساتھ دے سکتا ہو اس برجستگی سے اردو الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے کہ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور خود بہ خود ذہن نشین ہوتی چلی جاتی ہے اس کتاب کا پہلا باب اللہ کی سائنس: تشریح و توضیح کے حوالے سے ہے اس میں ذیلی سرخیاں شامل ہیں نجیبہ عارف نے اس خوبصورتی سے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے کہ کہیں کہیں معلوم ہونے لگتا ہے ان کا یہ ترجمہ ترجمے سے زیادہ تصنیف کہلانے کا مستحق ہے جس طرح عکسی مفتی نے مختلف مقامات پر مثالیں شامل کی ہیں نجیبہ عارف نے اتنی خوبصورتی سے ان مثالوں کا اردو ترجمہ کر کے ان واقعات کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور مثالوں کے ساتھ اپنی ہر بات کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر

We all live by the little well in the oasis, one man strays out to find the ocean and what do we

understand of experience except the amazment he produces, The mystery of something beyound he is simply untillegible to us, beyound our normal experience and imagination.(16)

''ہم سب کسی نہ کسی نخلستان میں ایک ننھے سے کنویں کے کنارے بستے ہیں اگر کوئی بھٹک کر کسی سمندر کے کنارے جا نکلے تو ہم اس کے تجربے سے سوائے تحیر اور اسرار کے اور کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ اس کا کشف ہماری سمجھ سے بالاتر ہی رہتا ہے ہمارے روزمرہ کے تجربات اور تخیل سے بعید تر،(۱۷)

اردو کی پروفیسر ہونے کے ناطے انھیں اردو زبان پر مکمل مہارت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے انھوں نے ترجمہ کرتے ہوئے مناسب الفاظ کے ساتھ ساتھ معیاری زبان بھی استعمال کی ہے اور اسلوب میں اپنا تشخص برقرار رکھا ہے کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ اس میں واقعی اچھے الفاظ کا استعمال ہوا ہے ہر لفظ موج تخیل کا کرشمہ ہے ان کا یہ ترجمہ اپنے اندر وہ تمام اصلاحات سمائے ہوئے ہے جن کی بدولت ترجمے کو ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ ترجمہ بجائے خود ایک مشکل فن ہے کسی زبان کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کو دوسری زبان میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے کیونکہ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے نہ صرف کئی زبانوں پر عبور حاصل ہو بلکہ علم و فضل میں بھی مصنف کے برابر مرتبہ و مقام رکھتا ہو۔ اور اس کے علاوہ ترجمہ کرنے کا ہنر بھی جانتا ہو نجیبہ عارف نے اس ناممکن کو ممکن بنا کر پیش کیا ہے اور یہ کام مکمل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اس ترجمے کو اپنی کاوش اور ہنرمندی سے ایک تخلیق کا درجہ دیا ہے ان کے ترجمے کی فضیلت و اہمیت کا اندازہ درج ذیل ترجمہ شدہ عبارت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً

God is reality

Then God is the most important thing in life or else,

He is only a wild goose chase of no substance.(18)

اگر خدا حقیقت ہے

تو وہ زندگی کی سب سے اہم چیز ہے ورنہ محض ایک سیراب............(۱۹)

ایک اور عبارت ملاحظہ ہو

One glance at the development of human intellect reveals that as human grow the must revise their views of reality. From time to time for intance, human conception of heavenly badies has varied according to the stature of their knowledge, The ancient egyptians in all earnest believed that the stars were lanterns lit by gods, which gods lots out every night on a string of cables and early mornig pulled off and put out, It is only lately that man has come to realize in the light of modern astonomy of the vastness and immensity of space the spread away into the unknown and yet what we know of it today is sure to expand further in years to come. Today we ca londer abide with an image of the cosmos the ancient egyptians or even the sixteenth century man built for us.(20)

''انسان کی فکری دریافتوں کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرتا جاتا ہے، حقیقت کے بارے میں اپنے علم پر نظر ثانی کرتا رہتا ہے مثال کے طور پر آسمانی اجسام کے بارے میں اس کے خیالات وتصورات اس کے علم

کی نوعیت کے مطابق وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں۔ قدیم مصری نہایت خلوص سے
یقین رکھتے تھے کہ ستارے دراصل دیوتاؤں کی روشن کی ہوئی لالٹینیں ہیں جنھیں وہ
ایک رسی سے باندھ کر رات کو باہر لٹکا دیتے ہیں اور صبح سویرے رسی کھینچ کر انھیں بجھا
دیتے ہیں یہ تو بالکل قریب کی بات ہے جب انسان کو پہلی بار علم فلکیات کی روشنی میں
ہی آسمانوں کی وسعت اور نامعلوم سرحدوں تک پھیلے ہوئے خلاؤں کی بے کرانی کا
کچھ اندازہ ہوا ہے۔ پھر بھی یہ بات یقینی ہے کہ آنے والے سالوں میں اس علم میں
اور بھی اضافہ ہوگا آج ستاروں کے بارے میں قدیم مصریوں حتی کہ سولہویں صدی
تک کے لوگوں کے تصورات بھی ہمارے لئے قابل قبول نہیں''۔ (۲۱)

اس ترجمے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمہ برائے ترجمہ قسم کی چیز نہیں بلکہ اس میں اس تخلیق کی روح کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے نجیبہ عارف نے اپنے وسیع مطالعے اور زبان پر مکمل عبور حاصل ہونے کی وجہ سے اسی زبان کا سہارا لیتے ہوئے ایسے الفاظ تلاش کئے جو معانی اور آہنگ میں اصل الفاظ کے ہم پلہ ہیں یہاں موزوں الفاظ کی موسیقیت اور ترنم جا بجا ملتی ہے اور کہیں بھی آہنگ کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی آورد کا احساس ہوتا ہے مثال کے طور پر (The Grand Design) کا ترجمہ عظیم تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ (agnostics) کا ترجمہ (لادین) (humanists) کا ترجمہ انسان پرست کیا ہے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے سے عام فہم ترجمے سے نجیبہ عارف بڑی مہارت سے عہدہ برا ہوئی ہیں اور نجیبہ عارف نے اپنے کمال فن سے یہ کٹھن مرحلہ بہ آسانی طے کیا ہے انھوں نے اس ترجمے کو دوسرے مترجموں کی طرح دقیق اور ناقابل فہم نہیں بننے دیا بلکہ حتی الامکان اسے سادہ اور آسان بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نجیبہ عارف ترجمہ کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں انھوں نے انتخاب الفاظ میں محنت شاقہ سے کام لیا ہے اور ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم سمیٹا جا سکتا ہے اور جس کے لئے انھوں نے استادانہ اسلوب سے کام لیا ہے خوبی یہ ہے کہ ان کی یہ ترجمہ شدہ کتاب صرف ترجمہ شدہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک تخلیق کا درجہ اختیار کیے ہوئے نظر آتی ہے۔ تیسرے باب کے شروع میں ایک ترجمے کی بہت خوبصورت مثال ملتی ہے۔

Go for Facts, The idea deludes, Grope for the idea,

The Facts derange.

Is actuality a spiet mirror, Is this the deranged reality

of man!(22)

حقیقت کو تلاش کریں تو خیال فریب دیتا ہے خیال کا تعاقب کریں تو حقیقت درہم

برہم ہو جاتی ہے کیا اصلیت ایک تڑخا ہوا آئینہ ہے؟

کیا یہی ہے انسان کی بکھری ہوئی منتشر حقیقت؟(۲۳)

نجیبہ عارف کا یہ ترجمہ کسی بھی مقام پر پھیکا بے رنگ یا بے جان دکھائی نہیں دیتا بندش الفاظ اور مختلف قسم کی اصطلاحات کا اپنی جگہ صحیح استعمال اور مصرعوں کی خوبصورت آمیزش نے اسے ایک خوبصورت رنگ عطا کیا ہے جسے پڑھتے وقت یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے صوتی تاثر قائم کرنے کی مترجم نے بھرپور کوشش کی ہے ترجمہ کرتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ الفاظ کو اسی طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تشنگی کم نہ ہو اور وہ بے جان محسوس نہ ہو۔ اور قاری کے لئے قابل فہم ہو اور بہت نظم وضبط کا خیال رکھا گیا ہے ان کے ترجمے کا انداز مختلف ہے غالباً مترجم کا مقصد اصل کے قریب تر رہنا تھا جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ آزاد ہو یا لفظی طور پر یہ ایک مشکل مرحلہ ہے جسے عام مترجم نہیں سمجھتے اور اپنے ہی وضع کردہ فارمولوں پر عمل کرتے ہیں مترجم کو کسی نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ آزادانہ ترجمہ کرے دراصل تخلیق کار بڑی عرق ریزی کے ساتھ اپنا فن پارہ تخلیقی سطح پر پیش کرتا ہے لہذا مترجم کا بھی فرض ہے کہ وہ اسی سطح پر آکر اسے دوسری زبان میں ترجمہ کرے لفظی ترجمہ کرتے وقت اسے اسی طرح محاورے کا استعمال کرنا چاہیے جو روزمرہ کی زبان میں مستعمل ہے مترجم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تخلیق کار کے فن پارے سے ہٹ کر ترجمہ کرے۔

عام سطح پر دیکھا جائے تو ترجمہ کرتے وقت مشکلات ومسائل کم وبیش وہی ہیں جو کسی بھی زبان کی تحریر کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت پیدا ہوتی ہیں ترجمے کیسے بھی کیوں نہ ہو وہ مترجم سے خاص صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی موجود ہو۔ بہ الفاظ دیگر اس

میں ایسی صلاحیت موجود ہو جس کے باعث وہ ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں رچ بس جائے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہو۔اس کتاب کے چوتھے باب سے ایک عبارت نجیبہ عارف کے انہماک اور توجہ سے کیئے گئے ترجمے کی اپنی مثال آپ ہے۔

The eatic system of early Greek thought put forth the doctrine of permanence and changelessness, as opposed the heraclitean school advcated the doctrine of flux and continual change by the goreans stressed the idealistic of mathemata which implied the totality of human knowledge while the democritus stressed the materialistic, the worlds as intelligent teleological system, it opposed all materialism, hedonism and egoism, epicureanism on the other hand, viewed reality as a mere machine an abject mechanism.(24)

یونان کے ایلیائی نظام فکر نے دوام اور عدم تغیر کا نظریہ پیش کیا جب کہ ہر قلیطس مکتب فکر نے اس کے برعکس بہاؤ اور مسلسل تبدیلی کے نظریے کی حمایت کی فیثا غورثیوں نے ریاضی کا ایک مثالی کلیہ دریافت کرنے پر زور دیا جو انسان کے کلی علم کو محیط ہو اور دیمو کریتسیوں نے مادیت اور جوہریت پر اصرار کیا رواقیت نے کائنات کو ایک با مقصد ذہانت سے مملو قرار دیا۔اور ہر قسم کی مادیت،لذیت اور انانیت کی مخالفت کی دوسری طرف اپنی قوریت نے حقیقت کو محض ایک مشین ایک حقیر میکانکی نظام کے طور پر پیش کر دیا۔''(۲۵)

اس ترجمے میں نجیبہ عارف نے اپنی طرف سے کوئی اضافے نہیں کیے بلکہ ترجمے کے لئے اردو کے زیادہ

سے زیادہ جامعہ اور خوش آہنگ الفاظ کا ترجمہ کیا ہے جس سے ان کا ترجمہ، ترجمہ ہونے کے باوجود طبع زاد معلوم ہوتا ہے چونکہ اس میں ان کا اپنا اسلوب صاحب کتاب کے اسلوب پر غالب آ کر اس کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ نجیبہ عارف نے اس ترجمے میں سنجیدہ اور منطقی انداز بنایا ہے۔ اس کتاب میں نجیبہ عارف کا اسلوب اپنے ہمہ رنگ پہلوؤں کے ساتھ موجود ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ مصنف کی بیان کردہ الفاظ اور تحریر کو اردو زبان میں اسی طرح قاری تک پہنچا سکیں کہ ترجمے کا احساس نہ ہو۔ پانچویں باب میں ایک خوبصورت مثال ملتی ہے جو اردو میں ترجمہ کرنے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

The west reads

From left to right

the East reads

From right to left

one from

Doubt to certainly

other

from certainly to doubt (26)

مغرب بائیں سے دائیں پڑھتا ہے

مشرق دائیں سے بائیں پڑھتا ہے

ایک شک سے یقین کی طرف

دوسرا یقین سے شک کی طرف (۲۷)

نجیبہ عارف انگریزی عبارت کا ترجمہ ہی نہیں کرتیں بلکہ انگریزی الفاظ کے ترجمے کے لئے اپنی عبارت میں اردو کے اچھے سے اچھے الفاظ بھی سمونے کی کوشش کرتی ہیں نجیبہ عارف عبارت کے مفہوم کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں ان کا مقصد تحریر کی اصل روح کو اردو زبان میں منتقل کر دیتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ

ترجمہ ایک اچھا اور کامیاب ترجمہ ہے جس میں نہ ادق پن ہے اور نہ ہی یہ صرف لفظی ترجمہ ہے بلکہ مصنف کے مفہوم کو مترجم نے قاری تک پہنچانے کی پوری کوشش کی ہے اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت اس کی سنجیدہ فضا کو برقرار رکھا ہے اور سادہ انداز نثر اپنایا ہے۔ نجیبہ عارف کے ترجمے میں ربط اور تسلسل ہے ایک غیر زبان کی علمی و محققانہ گفتگو کے ترجمے کے لئے نجیبہ عارف نے اپنی زبان سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو اصل متن کے مفہوم کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور مقالے کی تحقیقی و عالمانہ فضا کو بھی قائم رکھتے ہیں۔ مشہور مترجم عنایت اللہ دہلوی کے بقول

> ''ترجمہ ایسی محنت ہے جو کسی شکریے کی مستحق نہیں یہ معقول مترجم کی ہمدردی میں کہا گیا ہے مگر اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سکریے کا مستحق دراصل مصنف ہے مترجم کا کام صرف اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ ترجمے کو آسان سمجھتے ہیں ان کو یا تو ترجمے کا تجربہ نہیں یا علم کی قدر نہیں ترجمہ شکریے کا مستحق نہ ہو لیکن اگر دنیا میں مترجم نہ ہوتا تو روئے زمین پر علم کی جھیلیں اور دریا تو بہتیرے ہوتے مگر ان کو ملا کر علم کا بحر ناپید بنانے والا کوئی نہ ہوتا۔''(۲۸)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ترجمے میں حلاوت اور زبان کی گھلاوٹ ہے الفاظ دل نشین اور مطلب صاف و سلیس ہے ان کو شستہ اردو لکھنے میں کمال ہے ترجمہ کرتے ہوئے نجیبہ عارف نے ایک طاقتور اسلوب پیدا کیا ہے اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ ہونے کے بعد بھی اس کی چاشنی کم نہیں ہوتی اور نجیبہ عارف کے پختہ کار ادیب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ایک پختہ کار ادیب ہمیشہ اپنے علم و فراست سے متن کی نوعیت اور سیاق و سباق کے حوالے سے مترادفات منتخب کرتا ہے اسی سلسلے میں لغات سے بھی کام لیتا ہے۔

نجیبہ عارف نے بھی ترجمہ کرتے ہوئے اصل مصنف کے مزاج اسلوب اور تراکیب کو مدنظر رکھا ہے اور ترجمہ کرتے ہوئے عبارت کو اچھی سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان اور آہنگ کے مطابق ڈھال دیا ہے اس سلسلے میں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا ہے کہ بات میں ابہام پیدا نہ ہو انھوں نے اپنے انداز بیان لب و لہجے ذاتی عقل و شعور فہم و ادراک سے عکسی مفتی کے اس انگریزی مقالے کو فن ترجمہ نگاری میں وقار بخشتا ہے۔ بعض اوقات مصنف

اپنے خیالات کو بہتر انداز میں بیان نہیں کر پاتا جس سے اس کی عبارت گنجلک ہو جاتی ہے اس موقع پر مترجم اپنی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس انداز میں ترجمہ کرتا ہے کہ عبارت عام فہم ہو جاتی ہے نجیبہ عارف نے لفظوں کی تقدیم و تاخیر اور جملوں کی ساخت بدل کر نہایت ذہانت دار سے بطور مترجم اپنے فرائض انجام دیے ہیں۔اس سلسلے میں مثالیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

" Dust thou art to dust returnest'

soul thou art to soul returnes

science believes in the formes religion in the better

is this the interaction of the

beginning and the end

or polar percenptions of the same reality(29)

''تم چاک ہو اور خاک میں مل جاؤ گے''

تم روح ہو اور روح کی طرف لوٹ جاؤ گے

سائنس پہلی بات پر یقین رکھتی ہے

مذہب دوسری بات پر!

یہ آغاز اور انجام کا تعامل ہے۔

یا ایک ہی حقیقت کے ادراک کی دورخی؟ (۳۰)

مترجم نے Dust کے لئے خاک Soul کے لئے روح Interaction کے لئے تعامل جیسے آسان الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔مترجم کا کمال یہ ہے کہ وہ طویل جملوں کو ترجمہ کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملوں میں منقسم کر دے لیکن اس سلسلے میں ابلاغ میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہونا چھاہیے اور نہ ہی جملے کا کوئی حصہ حذف ہونا چاہیے اور انگریزی کے طویل جملوں کو اختصار کے ساتھ بیان سے کیا ہے جس سے ترجمے میں جامعیت پیدا ہوگئی ہے۔مثلاً

WORSHIP OF GOD IMAGE

Other religions like judaism and charistianity place stern restrictions on worship of manifestations or the worship of God image islam is particularly serve in the respect because Allah's qualitiesdo manifest and these manifestations are litely to beiwitch, enchant or charm man but these are not Allah and there fore Islam forbids their adoration, many religious have loeve misleading into polytheism and abject idolatry because of worship of manifestation.(31)

خدا کی شبیہ کی پوجا

''دوسرے مذاہب جیسے یہودیت اور عیسایئت مظاہر کی عبادت کرنے یا خدا کی شبیہ کو پوجنے پر سخت پابندی عائد کرتے ہیں اسلام تو اس معاملے میں خاص طور پر شدت کرتا ہے کیوں کہ اللہ کی صفات کے مظاہر تو بہر حال دنیا میں موجود ہیں اور یہ مظاہر انسان کو متاثر و مسحور بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ مظاہر اللہ نہیں ہیں اور اسی لیے اسلام ان کی پرستش کرنے سے منع کرتا ہے کئی مذاہب ابھی مظاہر کی پرستیش کے باعث بت پرستی اور کثرت پرستی جیسے فرومایہ اشغال میں بھٹک کر رہ گئے۔'' (۳۲)

نجیبہ عارف نے طالب علمانہ جستجو اور لگن سے لفظوں پر غور وفکر کرتے ہوئے ان کی مختلف تہوں کی گرہ کشائی کی ہے انھوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہے جو عکسی مفتی کی سوچ اور فکر کا متقاضی تھا گویا انھوں نے مصنف کی تحریر کی اصل روح کو لفظوں میں سمویا ہے ان کے ترجمہ کردہ جملوں میں جامعیت پائی جاتی ہے۔ایک اور جگہ ان کے ترجمے کئے ہوئے الفاظ کی خوبصورتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

Philosphic and Scientific import of divine Name In

understading God,

we also understand what it is meant to be human,

for after all,

God has been science times immemorial one of the deepest searches of human beings.(33)

اسمائے حسنٰی کی فلسفیانہ اور سائنسی معنویت

خدا کو سمجھنے نکلیں

تو انسان ہونے کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے

کیوں کہ آخر کار

خدا ازل سے موجود رہا ہے

اور انسان کی سب سے گہری طلب اور تلاش بھی تو وہی ہے۔(۳۴)

عکسی مفتی کے ان فلسفیانہ افکار و خیالات کو ترجمے کے قالب میں ڈھالنا نسبتاً دشوار تھا اور اس کے لئے خاصی محنت بھی درکار تھی نجیبہ عارف کے مطابق کئی مقامات ایسے بھی تھے جہاں بات ترجمے سے بڑھ کر ترجمانی تک جا پہنچی اور اس کے حوالے سے کہتی ہیں۔

''میں نے جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں اصلاح و ترمیم سے بھی کام لیا ہے اس لئے مجھے اطمینان ہے کہ اس ترجمے میں کوئی ایسی بات شامل نہیں جو منشائے مصنف کے خلاف ہو البتہ طرز بیان اور اسلوب کے بیش و کم کی ذمہ داری اکیلی مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔''(۳۵)

نجیبہ عارف کے لئے بذات خود اس کتاب کا ترجمہ کرنا ان کے لئے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ اور اس چیلنج سے عہدہ براہ ہونے کے لئے مطالعے کی جس وسعت و گہرائی اور دونوں زبانوں سے مکمل آگاہی کی ضرورت میں ان میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اس کتاب کے لئے یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا اگر عکسی مفتی اس کتاب کو اردو میں لکھتے تو شاید

یہی انداز اختیار کرتے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نجیبہ عارف نے تلاش اللہ ماوارلکھ کرفن ترجمہ نگاری میں اسے وقار بخشا ہے جو مترجم ہوتا ہے اس کا ادیب ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ اس فن کا مردمیدان ہوتا ہے اوراس کی گہرائیوں سے بہ خوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبان کے علم وادب کو دوسری زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے زبان و بیان کی یہ استعداد ترجمے میں اپنا اسلوب پیدا کرتی ہے۔

نجیبہ عارف کے ہاں بھی ہمیں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ انھوں نے ترجمہ کرتے ہوئے ترجمے میں ان تقاضوں کا خیال رکھا ہے اور اصل مصنف کے حقیقی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان تمام احساسات کو تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جس کہ وجہ سے ترجمے کی شان بڑھ گئی ہے انھوں نے ترجمہ کرتے ہوئے غیرضروری عبارت آرائی سے گریز کیا ہے اور لفظی ومعنوی تنقید سے حتی الامکان حد تک بچنے کی کوشش کی ہے انھوں نے غیر زبان کے الفاظ کی بندشوں میں خود کو گم نہیں کیا اور عبارت کو ابہام اور پیچیدگی سے محفوظ رکھا ہے اپنے علم ذہانت اور مہارت سے عبارت کو موثر ابلاغ کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مصنف کے فکر وفن اور ان کے محرکات پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ فن ترجمہ نگاری پر اپنے نقط نظر کی بھی وضاحت کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مصنف کے فکر وفلسفہ کی مناسبت سے الفاظ منتخب کیے ہیں جو اصل متن سے مطابقت بھی رکھتے ہیں۔

نجیبہ عارف بطور مدیر:

ادب کی تحریکوں کو جنم دینے اور رجحانات ومیدانات کو فروغ دینے میں ادبی رسائل اہم ترین و دستاویز شمار ہوتے ہیں ادب اور شاعری کی ترسیل وتوسیع میں یہ رسائل کتب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اردو زبان وادب میں ان رسائل کا آغاز انیسویں صدی سے ہوا مگر بیسویں صدی ادبی رسائل کا زریں دور ہے اس دور میں ادبی رسائل نے اپنے اپنے عہد میں نظم ونثر کی شاہ کار تخلیقات پیش کیں بڑی تعداد میں ادیب، نقاد اور شاعر پیدا کیے ہیں اور ادبی رسائل نے علمی وادبی مباحث کو زیادہ سے زیادہ موضوع بنا کر شعر وادب کے ساتھ علم وفن کو بھی فروغ دیا ادبی رسائل کے دائرہ کار اور مسلک کے متعلق افتخار امام صدیقی لکھتے ہیں۔

''قلم کاروں کو تحریک وترغیب دینا، انھیں دعوتِ نگارش دے کر نئے نئے موضوعات

پر لکھوانا، اپنی ہر اشاعت متنوع مضامین نظم ونثر شائع کر کے قارئین کے ذوق مطالعہ ادب کو تازہ و بیدار رکھنے کے ساتھ ساتھ قلم کاروں میں بھی خوب سے خوب تر کا جذبہ پیدا کرے کا عمل ادبی رسائل کا مسلک رہا ہے۔''(۳۶)

کسی بھی رسالے کی ترقی وترویج کے لئے اس میں شامل مضامین کے انتخاب اور ترتیب کے لئے مدیر کا ہونا ضروری ہوتا ہے اردو ادب میں صحافت کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف ہمارے عہد کی ایک بڑی شخصیت ہیں ہر چند تخلیق، تنقید اور تحقیق ان کے بڑے میدان عمل ہیں تاہم انہوں نے اپنے عہد کے ادیبوں کی تربیت میں بھی گراں قدر خدامات سرانجام دی ہیں اپنے ادبی، فکری اور تنقیدی نظریات کو عام کرنے کی خاطر انھوں نے ادبی صحافت سے بھی پیش از بیش کام لیا ہے ان کی ادارت میں انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کے رسالے ''معیار'' اور لمز یونیورسٹی کے رسالے ''بنیاد'' کی تین جلدیں منظر عام پر آئیں ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کا بڑا کارنامہ اشاریہ اردو جرائد منظر عام پر آیا جس میں ۱۹۹۱ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک شائع ہونے والے ۱۲ تحقیقی جرائد شامل ہیں اور ہر شمارے میں شامل مقالات کو الگ الگ مصنف وار مرتب کیا گیا ہے ہر مقالہ نگار کے نام کے سامنے اس کے مقالے کا مکمل عنوان صفحہ نمبر خلاصہ اور کلیدی الفاظ درج کئے گئے ہیں محققین کی سہولت کے لئے آخر میں مقالہ نگاروں کا اشاریہ بھی مرتب کیا گیا ہے جس کی مدد سے کسی بھی مقالہ نگار کے مقالات تک رسائی حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ نجیبہ عارف نے اردو کے ذوقِ ادب کو سنوارنے اور نکھارنے اور نئی بلندیوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اشاریہ سازی کے بارے میں اردو جرائد کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں۔

''اشاریہ سازی اسی نوعیت کی سرگرمی ہے جس سے محققین کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ زیرِ تحقیق موضوع سے متعلق مواد کو با آسانی تلاش کر سکیں دنیا بھر میں ایسی کئی تنظیمیں، ادارے اور مراکز قائم ہو گئے ہیں جو علمی و تحقیقی جرائد کے اشاریے شائع کرتے ہیں اور ان اشاریوں میں شامل ہونے والے جرائد علمی دنیا میں معتبر و مستند سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم ہنوز ایسے ادارے کی کمی محسوس کی جا رہی تھی جو بطور خاص اردو کے علمی و تحقیقی جرائد کا اشاریہ مرتب کرتا ہو اور اردو کے محققوں کو سہولت اور

رہنمائی فراہم کرتا ہو۔''(۳۷)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے معیار کے تین رسالوں کی ادارت کی اور لمز یونیورسٹی کے رسالے ''بنیاد'' کے ساتھ ابھی بھی منسلک ہیں اور ادارت کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں ان کے زیر ادارت شائع ہونے والے شمارے تعلیم وتدریس کے موضوعات کی نمائندگی کرتے ہیں جن سے مخصوص ذوقِ ادب کی ترجمانی ہوتی ہے ان کے شماروں کو پڑھ کر اور دیکھ کر نجیبہ عارف کی حقیقی ادبی خدمت کے جذبے کی جھلک دکھائی دیتی ہے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ نجیبہ عارف نے اپنا خون جگر لگا کر ان شماروں کی پرورش کی ہے نجیبہ عارف نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں، محبت اور لیاقت سے ان شماروں کو علمی و ادبی مجلّہ بنایا اور ان کی ترویج وترقی کے لئے دن رات کوشاں رہیں اور بہت کم وقت میں ان کو ترقی کی اعلیٰ وارفع منزل پر پہنچا دیا۔ حمیرا اشفاق ڈاکٹر نجیبہ عارف کے بارے میں کہتی ہیں

''ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ''معیار'' کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے بعد ازاں وہ بنیاد سے وابستہ ہوگئیں خواتین نیا ادارتی ذمہ داریاں انیسویں صدی کیا آخر سے ہی سنبھال لی تھیں جن میں نمایاں نام محمدی بیگم (تہذیب واخلاق) اور خاتون اکرم (عصمت) شامل ہیں لیکن دورِ حاضر میں خواتین اس میدان میں خال خال ہی نظر آتی ہیں ایسے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی بطورِ مدیر خدمات قابل ستائش ہیں اور دورِ حاضر میں خواتین کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ہیں گویا ماضی کا یہ ادارتی سفر انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر دورِ حاضر تک خواتین نمایاں حیثیت سے سنبھالے ہوئے ہیں۔''(۳۸)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ''معیار'' اور ''بنیاد'' کے شمارے میں مقالات اور منظومات کا انتہائی معیاری انتخاب شامل کیا ہے ان میں شامل مضامین ڈاکٹر نجیبہ عارف کی علم وآگہی سے گہری وابستگی، شبانہ روز محنت اور دماغ سوزی کا منہ بولتا ثبوت ہیں انھوں نے ہر شمارے کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے کام میں وقت کے ساتھ ساتھ وسعت اور پختگی پیدا کی جس سے اشاعتیں بتدریج بہتر سے بہتر ہوتی چلی گئیں ڈاکٹر نجیبہ عارف اپنے عزم میں پختہ تو شروع دن سے ہی تھیں لیکن وسائل اور تجربات نے انہیں آہستہ آہستہ سلیقے سے اپنی مدبرانہ صحافتی ذمہ داریاں ادا کرنے کے

قابل بنادیاان کی ادارت میں معیار کے جوشمارے شائع ہوئے ان شماروں میں ملک کے نامور مصنفین کی تحریریں بھی شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا اردوادب میں صحافت کے علاوہ تحقیق وتالیف کے میدان میں بھی مقام بہت بلند ہے انھوں نے علمی وادبی اور تحقیقی موضوعات پر کتابیں لکھیں ہمارا موجودہ عہد گروہی رویے یا گروپ سسٹم کا عہد ہے چنانچہ سیاست اور معاشرت کی طرح ادب کے میدان میں بھی گروہ بندی کا میلان اضافہ ہے ہم لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کے عادی نہیں رہے ہماری تمام تر وسعت نظر سمٹ کر ایک ہی نقطے پر مرکوز ہوکر رہ گئی ہے اور اس رجحان نے ادب میں تعصب اور نفرت کو فروغ دیا ہے آج ہر ادیب، ہر نقاد اور ہر شاعر ایک مخصوص دبستان، مخصوص حلقہء خیال اور ایک مخصوص ادبی گروہ کے حوالے سے پہچانا جانے لگا ہے لیکن نجیبہ عارف کبھی کسی گروہ بندی کا حصہ نہیں رہیں نہ ہی کسی تحریک یا ادبی گروہ سے ان کا کوئی تعلق رہا ہے انھوں نے معیار اور بنیاد کو ایک کھلے پلیٹ فارم کی صورت دی جہاں بغیر کسی تعصب اور گروہ بندی کے تمام لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں اس حوالے سے معیار اور بنیاد ایسے شمارے ہیں جس کے دروازے ہر اچھی تخلیق کے لیے وارہتے ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کو ادبی حلقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے انھوں نے انتہائی محنت، لگن اور انہماک کے ساتھ ''اشاریہ اردو جرائد'' بھی ترتیب دیا اور اس کے ساتھ ساتھ معیار اور بنیاد جیسے جرائد کی آبیاری کی اور مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہی ہیں ان کا شمار ان قلم کاروں اور محققوں میں ہوتا ہے جو ستائش کی تمنا اور حوصلے کی پرواہ کیے بغیر قلندارانہ رو میں چپ چاپ سر جھکائے اپنا کام کیے جاتے ہیں انہوں نے اپنے مقصد اور کام سے لگن میں ایسی راہ متعین کی جو قابلِ تقلید ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف جس خلوص اور محبت کے ساتھ ان جرائد کی ترویج واشاعت اور تحفظ کے لیے کوشاں ہیں وہ نہ صرف لائق تحسین بلکہ معتبر حوالہ بھی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ جرائد مستند جرائد کی صف میں کھڑے ہیں ان شماروں میں مواد کی فراہمی، مضامین کے انتخاب اور ترتیب، تدوین، کمپوزنگ اور طباعت کے صبر آزما مراحل بھی خود ساتھ ساتھ دیکھتی ہیں ہر شمارے میں ان کی تخلیقی وادبی خدمات سرورق سے لے کر آخر صفحہ تک نمایاں ہوتی ہیں اور تقریباً ہر شمارے میں ان کا اپنا بھی کوئی نہ کوئی تبصرہ شامل ہوتا ہے ان کی ادارت میں شمارے کبھی تعطل کا شکار نہیں ہوئے معیار کے جوشمارے ان کی ادارت میں شائع

ہوئے ان میں نایاب کلاسیکی، متون، دریافت تقدیم، تدوین اس کے علاوہ افکار تازہ، بیادرفتگاں جس میں گوشۂ شبلی اور سید سلیمان ندوی کا اشتراک علمی، مکاتیبِ سید سلیمان ندوی، توقیت شبلی جیسے اہم موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ گوشۂ مجید امجد میں ناصر عباس نیر اور شیراز فضل داد کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے گوشۂ سلیم احمد میں شمس الرحمٰن فاروقی اور عزیز ابن الحسن کے مضامین شامل ہیں اس کے بعد تحقیق وتنقید اور تبصراتی مقالہ جات کے ساتھ ساتھ انگریزی مضامین کو بھی ''بنیاد'' کا حصہ بنایا گیا ہے۔ بنیاد کی جلد پنجم کے اداریے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں

> ''اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے علمی دنیا میں زندگی کے بارے میں ایک ہمہ گیر کلی نقطہ نظر کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے نتیجتاً علمی حلقوں میں بین العلومی مطالعات کی اہمیت بڑھ گئی ہے بنیاد بھی اسی پالیسی پر کارفرما ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے گذشتہ شمارے کی طرح اس شمارے میں بھی ایسے مضامین شامل کیے ہیں جو دراسات کے ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ علوم وفنون سے تعلق رکھتے ہیں'' (۳۹)

بنیاد کی جلد چہارم بھی ان کی ادارت میں شائع ہوئی اس میں بھی تحقیق، تنقید، تراجم اور تبصرہ کتب کو علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اس میں بھی بیادرفتگاں کے عنوان سے ایک خصوصی گوشۂ ترتیب دیا گیا جس میں معروف محقق عبدالستار صدیقی کی علمی وتحقیقی خدمات کے مفصل مطالعے پر مبنی مقالے کے علاوہ اردو نظم کے معروف شاعر میراجی کے تخصیصی مطالعے بھی شامل ہیں جس میں ان کی شعری وفکری جہات کے ساتھ ساتھ ان کے تراجم کو بھی موضوع بنایا گیا ہے بنیاد کے رسالوں کی ضخامت پہلے کے شماروں کی نسبت اب زیادہ ہے کیونکہ اب یہ شمارہ سالانہ بنیاد پر شائع ہوتا ہے۔ بقول نجیبہ عارف

> ''لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے گرمانی مرکز زبان وادب کے زیر اہتمام بنیاد جیسے علمی وتحقیقی مجلّے کا اجرا اردو زبان کے حوالے سے اہم قومی ذمہ داری سے بزدآزما ہونے کی ایک قابل ستائش کوشش ہے۔'' (۴۰)

اسی طرح معیار کے شمارے جنوری تا جون ۲۰۰۹ء میں بھی تحقیق وتدوین تنقید وتجزیہ اور تراجم کو شامل کیا گیا ہے اس کے اگلے شمارے میں تحقیق وتدوین دریافت وانکشاف مطالعہ وتجزیہ کے مقالات شامل کیے گئے ہیں اس

شمارے میں بھی تراجم کو جگہ دی گئی ہے ۲۰۱۰ء کے شمارے میں ماخذ تحقیق، تحقیق و تدوین متن مطالعہ و تجزیہ، ترجمہ اور تبصراتی مقالہ بھی شامل ہے۔

بطور مدیر اعلیٰ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مجلّات کا تعارفی جائزہ لینے کے بعد ان کا تنقیدی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ترتیب دیئے گئے یہ مجلّات ان کے انہاک توجہ اور دلچسپیوں کا مظہر ہیں۔

۲۔ ان مجلّات میں بیادِ رفتگاں آپ کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں آپ دوسروں سے ہٹ کر منفرد کام کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ شمارے ڈاکٹر نجیبہ عارف کی محققانہ بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ جس سے ان کے تحقیقی میدانِ طبع اور تلاش و جستجو کے عنصر کی نشاندہی ہوتی ہے۔

۴۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اپنے ان مجلّات میں بہت محتاط اور دل لگی سے کام کرتی ہیں اور مقالات کو ادارت کے اصولوں پر تحقیقی لگن سے ترتیب دیتی ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ترتیب دیئے گئے یہ شمارے ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی غمازی کرتے ہیں۔

۶۔ وہ ایک زیرک اور منجھی ہوئی نقاد و محقق کے طور پر محنت و لگن کے ساتھ حاصل شدہ مواد کو احسن طریقے سے ترتیب دیتی ہیں۔

۷۔ ان کا مرتب کیا گیا کوئی مجلّہ بھی عام روش اور سادہ انداز پر نہیں ہے۔

۸۔ ان کے شماروں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف دوسروں سے کام لینا بھی جانتی ہیں انہوں نے جس طرح ناظم طباعت و اشاعت گردانی مرکز کی رابطہ کار اور ان کے معاونین اس کے علاوہ ڈین کلیہ انسانی و سماجی علوم سے جس سرعات اور کمالِ فن سے کام لیا ہے وہ قابل داد ہے۔

۹۔ ان کے یہ شمارے خاصے دقیع اور پھیلے ہوئے مواد پر مشتمل ہیں جو ہزارہا مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ہی اکٹھا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نجیبہ عارف اس لحاظ سے قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے مدیرانہ حوصلے

سے کام لیتے ہوئے ہر مشکل کو دور کیا اور پڑھنے والوں کو ایک نئی اور معلومات افزاء دنیا سے متعارف کروایا۔

۱۰۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف بنیادی طور پر ترتیب و تدوین کے فن سے بھی بخوبی آگاہ ہیں سخت جدوجہد اور محنت کی شوقین ہونے کے ساتھ ساتھ کام کی دھنی بھی ہیں اور مستقل مزاج بھی۔

۱۱۔ یہ شمارے اپنی سطح پر اگر کامیاب ہیں تو اس کامیابی میں ان کی مدیرانہ محویت کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔

الغرض ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مرتب کردہ یہ تمام شمارے ان کی علمی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی اقدار کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی، تدوینی اور تحقیقی صلاحیتوں سے بھی پردہ اٹھانے کا باعث ہیں یہ شمارے ان کو ایک کامیاب مدیر کے طور پر سامنے لاتے ہیں موضوعات اور مواد کی بناء پر زبان و ادب ہمیشہ یادگار اور قابل دید رہیں گی۔

موضوعات کے تنوع، مضامین کا انتخاب، نظم و آپ بیتی کا معیار، تخلیق کاروں کی سنجیدگی اور تنقیدی بصیرت مدیران کے ساتھ ساتھ معاون مدیر کی بھی ذہنی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہے یہ نجیبہ عارف کی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی اپج کی بھی نشاندہی کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک کامیاب مدیر بن کر سامنے آئی ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کالج میں مضمون نگار بھی تھیں مقرر بھی تھیں اور شاعرہ بھی اور ان کے بہت سے مضامین کہانیاں رسالوں میں بھی چھپتی رہیں گویا وہ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت آگے تھیں نہ صرف آگے تھیں بلکہ سب سے آگے تھیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی ان کے اندر متحرک ادیب، دانشور اور مدون و مرتب چھپا ہوا تھا۔ مندرجہ بالا بحث کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معیار اور بنیاد ایسے شمارے ہیں جس نے پرانے ادیبوں کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ نئے ادباء اور ان کی تخلیقات کو بھی متعارف کرایا ان مجلّات کو عروج پر پہنچانے کے لئے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے انتھک کوشش کی۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر ان کی ساتھی مدیر شیراز فضل اور معین عقیل کا ذکر نہ کیا گیا تو یہ بھی زیادتی ہوگی کیونکہ ان کی مدد بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف کے لئے ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی اور انتھک کوششیں محنت جو بھی نجیبہ عارف نے کیں وہ ہمیں ان کے رسالوں میں نظر آتی ہیں اور ان کی لگن سے انکار نہیں کیا جاسکتا ان رسالوں کو عروج پر پہنچانے کے

لئے جو محنت، کوشش اور جدو جہد کی اسی کے نتیجے میں ہمیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی مدیرانہ صلاحیتوں سے بھی آ گہی حاصل ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مظفر علی سید ''فن ترجمہ کے اصولی مباحث''، روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۴۳

۲۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، ''افسانوی ادب کے تراجم'' مسائل اور مشکلات، روداد سیمینار اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص ۱۹۹

۳۔ مظفر علی سید ''فن ترجمہ کے اصولی مباحث''، روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۶ء ص ۳۸

۴۔ مرزا حامد بیگ، اردو زبان میں تراجم کا جائزہ، روداد سیمینار، ص ۸۰

۵۔ مرزا حامد بیگ ، اردو زبان میں تراجم کا جائزہ، روداد سیمینار، ص ۱۸۵۔۱۹۲

۶۔ عبدالمجید سالک ترجمے کے چند پہلو (مزاکرہ) ص ۴۰

۷۔ عبدالحق مولوی تراجم کی اہمیت، ص ۱۳۴

۸۔ فخری، احمد حاجی دورِ تراجم مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن، ص ۳۸۔۴۰

۹۔ محمد حسن عسکری، گر ترجمے سے فائدے اخفائے حال ہے مشمولہ بادبان، مکتبہ سات رنگ کراچی ۱۹۷۱ء، ص: ۱۴۷

۱۰۔ نجیبہ عارف (مترجمہ) تلاش اللہ ماورا کا تعین، از عکسی مفتی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۹

۱۱۔ نجیبہ عارف (مترجمہ) تلاش اللہ ماورا کا تعین، از عکسی مفتی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۵

۱۲۔ نجیبہ عارف (مترجمہ) تلاش اللہ ماورا کا تعین، از عکسی مفتی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۱

۱۳۔ نجیبہ عارف (مترجمہ) تلاش اللہ ماورا کا تعین، از عکسی مفتی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۱

۱۴۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 17

۱۵۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۳۲

۱۶۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 10

۱۷۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۴۳

۱۸۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page28

۱۹۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۴۴

۲۰۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 29

۲۱۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۴۵

۲۲۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 35

۲۳۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۵۴

۲۴۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 50

۲۵۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۷۱

۲۶۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 61

۲۷۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۸۶

۲۸۔ عنایت اللہ دہلوی (بحوالہ) اخبار اردو، شمارہ فروری، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۳۷۴

۲۹۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu

bazar Lahore, Page 97

۳۰۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۲۶

۳۱۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page 225

۳۲۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۲۹۴

۳۳۔ Aksi Mufti "Allah measuring integible" Alfaisal Nashran Urdu bazar Lahore, Page384

۳۴۔ عکسی مفتی، تلاش اللہ ماورا کا تعین، مترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف، الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۲۶۲

۳۵۔ نجیبہ عارف (مترجمہ) تلاش اللہ ماورا کا تعین، از عکسی مفتی الفیصل ناشران لاہور ۲۰۱۲ ص ۱۴

۳۶۔ افتخار احمد صدیقی ''اردو کے ادبی مسائل''، مضمون مشمولہ: اردو صحافت مرتبہ انور علی دہلوی، بک ٹاک لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۴

۳۷۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، پیش لفظ، اشاریہ اردو جرائد، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۱۴ء، ص: ۵

۳۸۔ حمیرا اشفاق (انٹرویو) از نادیہ حفیظ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۳۲ اپریل ۲۰۱۶ء بوقت ۱۱ بجے دن

۳۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، اداریہ، بنیاد، لمز یونیورسٹی لاہور، جلد پنجم، ۲۰۱۴ء، ص ۵

۴۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، پیش لفظ، بنیاد، لمز یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۳ء ص ۷

باب پنجم

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحیثیت تخلیقی ادیب

ڈاکٹر نجیبہ عارف بطور سفر نامہ نگار:

سفر نامہ ان قلبی تاثرات واحساسات کا مجموعہ ہے جو دوران سیاحت مختلف مناظر اور مقامات کو دیکھ کر سیاح کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک سیاح کے لیے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں سفر نامے میں مصنف جہاں سفر کے مشاہدات و واقعات اور تجربات کو تحریر کرتا ہے وہیں قلبی تاثرات کو بھی اس میں شامل کرتا جاتا ہے شفیق الرحمٰن سفر نامے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

> ''غیر جانبداری اور غیر متعصّبانہ انداز میں لکھی گئی معنوی تجربات و مشاہدات سے متعلق ایسی تحریر جس میں دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات پوری صحت کے ساتھ دیانتداری سے بیان کئے گئے اور جو غیر ضروری معلومات کے بوجھ سے آزاد ہوں جہاں مناظر قدرت اور سفری حالات سیاح کی آنکھوں کے ذریعے روح میں اتریں ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے کی آگہی دیں جس کی پیش کش خالص تخلیقی نوعیت کی ہو لیکن مبالغہ آرائی سے بالکل پاک وصاف ہو سفر نامہ ہے۔''(۱)

سفر نامہ تخلیق کرنے کے لئے سفر نامہ نگار کے لئے سیاح ہونا اولین شرط ہے کیونکہ مسافر زندگی کو محض ایک قید خانہ تصور کرتا ہے اور دوران سفر پیش آنے والی مشکلات اسے ذہنی وجسمانی طور پر بہت ناگوار گزرتی ہیں جبکہ سیاح کے لئے دنیا ایک آئینہ خانہ ہے اور اس میں پھیلے ہوئے مظاہر اسے دعوت فکر دیتے ہیں دوران سیاحت پیش آنے والی مشکلات کو شوق نگاہ سے دیکھتا ہے۔

> ''سیاح کا امتیازی وصف ہی یہی ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے قطعاً منقطع ہو کر کسی غیر مادی شے کی طرح سبک اور مطیف ہو جاتا ہے اور بندھنوں اور

حد بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے کی سی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔مسافر کی
حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی جالے میں قید ہو کر جالے کے ایک سرے سے
دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا
بڑھتے چلا جائے۔۔۔۔۔۔۔سیاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔۔۔۔۔جبکہ مسافر تو
حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔''(۲)

سفرنامے کے حوالے سے ایک اور بات کی وضاحت لازمی ہے کہ سفرنامہ نگار کے لئے ادیب ہونا ضروری نہیں تاہم اس کے اندر ادیب کے خواص کا موجود ہونا بھی ضروری ہے اور یہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ سفرنامہ لکھتے ہوئے سیاح کو ادیب کی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑتی ہیں اور ایک اچھا سفرنامہ اسی وقت تخلیق ہوگا جب خارج کے مشاہدات کے ساتھ ساتھ داخل کا ادیب بھی بیدار ہوگا۔سفرنامے میں اس بات کو بھی اولیت حاصل ہے کہ سفر کے لیے کون سا وسیلہ اختیار کیا گیا ہے اور دوران سفر مختلف شہروں اور علاقوں میں قیام کا وقفہ کتنا ہے یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کوئی بھی مقام اور شخصیت اپنے اسرار دوسروں پر فوری طور پر منکشف نہیں ہونے دیتی بلکہ اس سرزمین پر رہنے اور اس کے باسیوں سے گھلنے ملنے کے بعد ہی ظاہر ہوتے ہیں اور یہی چیزیں سفرنامے کی جاذبیت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔سفرنامے کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ سفرنامے کے لیے کس تکنیک کا انتخاب کیا گیا ہے موزوں تکنیک کا انتخاب سفرنامے کی دلچسپی اور تاثر کو بڑھانے میں بہت حد تک معاون ہوتا ہے مواد کی چھان بین کا مرحلہ بھی سفرنامہ نگار کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اگر وہ بغیر سوچے سمجھے ساری تفصیلات کو سفرنامہ میں ڈال دے گا تو وہ سفرنامہ نہیں تبصرہ بن جائے گا اس لیے ایک بہترین سفرنامہ وہی ہوگا جس میں ادیب اور سیاح قدم ملا کر چلتے نظر آتے ہیں سیاح اپنی قوت باصرہ سے اشیاء کو دیکھتا اور ماحول سے جزئیات کو سمیٹتا چلا جاتا ہے جبکہ ادیب مواد کی چھان پھٹک کے بعد اسے خوبصورت اور دلکش پرائے میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے

سفرنامہ نگاری کا آغاز چونکہ اس مقصد کے تحت ہوا تھا کہ لوگوں کو ان ممالک کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں جن کا انھوں نے سفر نہیں کیا ایک چیز اور جو سفرنامے میں موجود معلومات کی نوعیت کو سب سے زیادہ متاثر

کرتی ہے وہ سیاح کا شعبہ زندگی وہ جس شعبے سے تعلق رکھتا ہے اس کی معلومات کا رخ بھی اسی حوالے سے ترتیب پاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر سفر نامہ نگار کا تعلق علمی اور ادبی ماحول سے ہے تو اس کی معلومات کا رخ درسی و تدریسی ہو گا سفر نامے کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی عنصر مشاہدہ ہے مشاہدے کے بغیر سفر نامہ بے معنی ہے کسی بھی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ سیاح کا مشاہدہ کتنا گہرا ہے اور اپنے اردگرد پھیلے مناظر کی خارجی و داخلی جگہوں کو دیکھنے کی صلاحیت اس میں کتنی ہے سفر نامے کے لیے خام مواد گرد و پیش سے ہی اکٹھا کیا جاتا ہے یہ مواد سفر نامہ نگار کے چاروں طرف بکھرا ہوا ہوتا ہے یہ اس کی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ ان واقعات و تجربات میں سے کس کس کا انتخاب اپنے سفر نامے کے لیے کرتا ہے۔

> ''اچھا سفر نامہ وہ ہے جس میں مشاہدے کی گہرائی ،ثقافتی مطالعے کا سلیقہ،اختلافات کے باوجود بنی نوع انسان کی اساسی وحدت کا شعور اور اجنبی دیار و احصار کی زندگی کا ایسا صحیح تعارف شامل ہو جس میں صداقت ہونے کے علاوہ قارئین کے لیے دلچسپ ،خیال انگیز اور بصیرت افروز ہو۔''(۳)

سفر نامہ نگار کی دلچسپیاں ،اس کی پسند و ناپسند،اس کا اندازِ فکر اور رویہ سفر نامے کو دلچسپ اور غیر دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اس لئے سیاح کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوران سفر اپنے حواس کو بیدار رکھے اور مناظر کے خارجی حسن کے ساتھ ساتھ داخلی حسن کو بھی اپنی قوت باصرہ سے جذب کرنے کی کوشش کرے اس طرح مشاہدے سے نہ صرف مناظر کی ظاہری تصویریں سفر نامے میں منتقل ہوسکتی ہیں بلکہ باطنی گہرائی کے ساتھ سفر نامے کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔چونکہ سفر نامے کا بنیادی عنصر ہی مشاہدہ ہے اس لئے سیاح کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مشاہدے میں آنے والی سبھی چیزیں توازن کے ساتھ بیان کرے۔سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے اور زندگی کے اس مشاہدے کو سفر نامے میں منتقل کر دیتا ہے اور آنے والا زمانہ اس دور کی روح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے۔

جس طرح ادب کی ہر صنف اپنی ضروریات اور تقاضوں کے لحاظ سے دیگر اصناف سے مختلف ہوتی ہے اس طرح زبان و بیان کے حوالے سے بھی تمام اصناف میں فرق و امتیاز پایا جاتا ہے چنانچہ داستان کی زبان اور اسلوب،

ناول کی زبان واسلوب سے مختلف ہوتی ہے اور انشائیہ کی زبان واسلوب افسانہ کی زبان واسلوب سے الگ نوعیت کی ہوتی ہے اسی طرح سفر نامہ کی صنف ایک انفرادی اسلوب اظہار کی مالک ہے سفر نامہ چونکہ مختلف مقامات ومناظر کا چشم دید بیانیہ ہوتا ہے چنانچہ سفر نامہ نگار کو زبان وبیان کے حوالے سے خاصی احتیاط ملحوظ رکھنا پڑتی ہے سیاح پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مختلف واقعات وشخصیات کو بیان کرتے ہوئے موقع ومحل کی مناسبت سے زبان اور اسلوب کو اختیار کرے۔

''کہیں سادہ سلیس اور شگفتہ کی ضرورت ہوگی اور کہیں رمزیت اور ایمائیت والی زبان کی، کہیں سفر نامہ انشائیہ کی زبان کا طالب ہوگا اور بعض مقامات پر اس میں مزاج کے عناصر کی شمولیت کی بھی ضرورت محسوس ہوگی گویا سفر نامہ نگار منظر اور موضوع کے اعتبار زبان واسلوب برتنے کی کوشش کرے گا۔'' (۴)

سفر نامے کا ایک نمایاں وصف اس کی منظر کشی ہے اسے سفر نامے کی روح قرار دیا جا سکتا ہے سفر نامہ چونکہ سیاح کے مشاہدے کا مرہون منت ہوتا ہے اس لئے سیاح کا یہ فرض ہے کہ وہ منظر کشی کرتے ہوئے حقیقی اور جاندار مناظر کو سفر نامے میں شامل کرے کیونکہ منظر کشی جس قدر توانا ہوگی اسی قدر سفر نامے میں صداقت کے عناصر پیدا ہونگے اور قاری اس سے وہ حقیقی مسرت حاصل کر سکے گا جسے سیاح نے محسوس کیا ہے تاہم سفر نامے میں حقیقی منظر کشی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں تخیل کو بھی کامیابی سے استعمال کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کے نزدیک بھی منظر کشی سفر نامے کا بنیادی عنصر ہے۔

''سفر نامے کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی نثر دلکش ہو، مشاہدہ گہرا ہو، مصنف جس لطف سے سرشار ہے، قاری کو اس میں برابر کا شریک کر سکے، مصنف کے ساتھ قاری بھی سیر کرنے لگے۔'' (۵)

ڈاکٹر نجیبہ عارف گو کہ عصر حاضر کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں جہاں انھوں نے اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی میدان میں خاطر خواہ خدمات سر انجام دی ہیں وہاں انھوں نے سفر نامے بھی لکھ کر اپنی صلاحیتوں کو منوایا ہے ان کے سفر ناموں میں اگر ایک روایت کی پاسداری کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو دوسری طرف یہ

سفرنامے فکر وفن کا ایسا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں جس سے جدت خیال اور ندرت اظہار کے کئی زاویے سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے یونیورسٹی آف لندن کے سکول اوف ایفریکن اینڈ اورینٹل سٹیڈیز میں تین ماہ کے لیے چارلس والس فیلوشپ پروگرام کے لیے لندن کا سفر کیا اور اس سیاحت کے بعد ان کا یہ سفر نامہ سہ ماہی ادبیات میں 'جگہیں، چہرے، یادیں، اور خیال' کے عنوان سے شائع ہوا اس سفرنامے کو دو قسطوں میں تقسیم کر کے شائع کیا گیا۔ دوسرا سفرنامہ'' آرے رانگ'' (جنوبی کوریا کا سفر) یہ چھ قسطوں میں وقتاً فوقتاً ماہنامہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن سے چھپتا رہا یہ سفرنامہ جب وہ دو ماہ کے لیے کورین والنٹیر زکو پڑھانے کے لیے کوریا گیئں تو واپسی پر ان کا یہ سفرنامہ منظر عام پر آیا۔ نجیبہ عارف کا پہلا سفرنامہ جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ وہ کوریا جاتے ہوئے بحرین ائیر پورٹ پر رکیں کیونکہ ان کے والد صاحب نے ان سے دور اپنی زندگی کے بیس سال وہاں گزارے تھے تو نجیبہ عارف نے بہت سی یادداشتوں کو بھی اس سفرنامے کا حصہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے سفرناموں میں اپنی ذات کو کہیں بھی گم نہیں ہونے دیا انھوں نے ایک فطری سیاح کی طرح انسانی تہذیب اور انسانی ارتقاء کی مختلف علامتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ دوران سفر خارجی حقائق اور مناظر کو اپنے باطن میں جذب کرتی ہیں اور جب یہ حقائق ان کی شخصیت میں رچ بس کر تحریری صورت سامنے آتے ہیں تو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ بلاشبہ نجیبہ عارف ایک بہت منجھی ہوئی سیاح ثابت ہوئی ہیں وہ بھری دنیا میں خود کو گم کر نے کی بجائے ہر چیز کو مشرقی زاویے سے دیکھنے کی قائل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرق کا سیاح جب مغرب جیسے ترقی یافتہ ملک میں سائنسی ایجادات کا سامنا کرتا ہے تو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن مغرب کے اس سائنسی انقلاب کے سامنے مشرقی سیاح اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ ماضی بعید میں جب مشرق تہذیب وتمدن اور اخلاق وآداب کا گہوارہ تھا اور دنیا کے تمام علوم مشرق کی کوکھ سے جنم لے رہے تھے اس وقت مغربی معاشرہ جہالت اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا چنانچہ مشرقی سیاح صنعتی ترقی کے سامنے اپنے شاندار ماضی کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ہاں مشرقی سیاح کی یہ روایتی صورت کئی مقامات پر آشکار ہوئی ہے تاہم ان کی یہ

انفرادیت ہے کہ وہ منظر سے مرعوب ہونے کی بجائے اس کی انفعالی صورت کو اجاگر کرتی ہیں اور قاری پر یہ بات واضح کرتی ہیں کہ منظر کی قدر و قیمت محض اس لیے بڑھ گئی ہے کہ اس پر نجیبہ عارف نے نظر ڈالی ہے۔

''سیول سے بڑی شاہراہ پر باہر نکلنے کے کچھ ہی بعد ایک تنگ اور دو طرفہ سڑک اچھون کی طرف مڑتی ہے جس کے دونوں طرف نیچی پہاڑیاں یا چاول کے کھیت اچھون شہر سے دس پندرہ کلومیٹر پہلے ایک پتلا سا بل کھاتا راستہ دائیں طرف مڑتا ہے ہرے بھرے کھیتوں کے درمیاں سے ہوتا ہوا یہ مختصر راستہ یونیسکو سنٹر کے داخلی دروازے کو اچھوتا ہوا اندر تک نکل جاتا ہے یہ سنٹر اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے کی ملکیت ہے اور پانچ چھ عمارتوں پر مشتمل ہے سب سے پہلے بائیں طرف ایک سبزہ زار کے عقب میں مرکزی دو منزلہ عمارت ہے جس میں نچلی منزل پر کھانے کا ہال کمرہ باورچی خانہ اور چھوٹی سی دکان ہے۔''(٦)

نجیبہ عارف جس شہر بھی گئیں اور جن ممالک اور اقوام کا حال ان کی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا وہ سب تفصیل کے ساتھ انھوں نے اپنے سفرناموں میں پیش کر دیا دوران سیاحت انھوں نے شہروں، ملکوں اور ان میں بسنے والے لوگوں کو سرسری نظروں سے نہیں دیکھا بلکہ انھوں نے ہر شہر کی خصوصیات اور نوادر کو دلچسپی سے دیکھا ہے پھر ان کے بارے میں قیمتی آراء کو بھی بیان کرتی ہیں۔

''دراصل لندن محض شہر نہیں ایک طرز حیات ہے ایک انداز فکر ہے، ایک قرینہ زندگی ہے جب آپ لندن میں رہنے لگتے ہین تو لندن بھی آپ میں آ کر رہنے لگتا ہے کبھی لگتا ہے اس سے محبت ہو گئی ہے کبھی لگتا ہے محبت نہیں ہے۔ وقتی ابال ہے۔ دور جاتے ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور کبھی لگتا ہے کہ یہ آپ کے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔'' (٧)

اس ناآشنا اور اجنبی ماحول میں پاکستان کی محبت ان کو تر و تازہ کر دیتی ہے نجیبہ عارف کے سفرناموں میں بعض جگہ ان کی وطن سے اٹوٹ محبت جذب و کیف کی صورت پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتی ہیں۔

''ائیر پورٹ کی طویل راہداریاں طے کرتے کرتے پاؤں شل ہورہے تھے میں نے دیکھا کچھ مسافر سامان سمیت انجن نما گاڑیوں پر سوار ہو کہ یہ فاصلہ طے کر رہے تھے مگر میں کس سے کہتی کہ سانوں وی لے چل نال وے باؤ سوہنی گڈی والیا۔ پاکستان میں اگر کوئی خاتون اکیلی ہو تو بہن جی، خالہ جی، باجی جی کہ کر اللہ کے کئی نیک بندے سامان پکڑ لیتے ہیں، مدد کر دیتے ہیں اور اگر اکیلی نہ ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے سامان اٹھانا پڑے گھر کے مرد اسے اپنی مردانگی کے منافی سمجھتے ہیں۔(۸)

پاکستان نجیبہ عارف کا ملک ہے اس لیے اس سے جذباتی وابستگی سے ان کا دل دھڑکتا ہے شعوری طور پر پاکستان کی تہذیب اور ثقافت کو اجاگر کرنے میں ان کو خوشی ہوئی ہوگی۔ مثلاً

''میں نے پہلی بار غور کیا کہ میری شلوار قمیض وہاں موجود تمام لوگوں کے لباس سے بہت مختلف اور کم و بیش ہر ایک کی توجہ کا مرکز تھی قمیض اور دوپٹے پر ہاتھ کی کڑھائی نے تو انھیں پاگل سا بنا دیا تھا دوپٹہ بھی ان سب کے لیے ایک عجیب سی چیز ہے اس لیے اسے پہنتے ہوئے مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میں کوئی غیر معمولی اور خاص لباس پہن رہی ہوں''۔(۹)

ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک ایسی سیاح کے طور پر سامنے آتی ہیں جو گرد و پیش کے حادثات و واقعات سے بے خبر نہیں بلکہ وہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتحال کا جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کے سفرناموں کو پڑھتے ہوئے پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور قاری پورے لطف و دلچسپی کے ساتھ حیرتوں میں ڈوب جاتا ہے۔

''فیئر لوپ اسٹیشن انڈر گراؤنڈ نہیں ہے بلکہ زمین کی سطح سے خاصا بلند ہے اور گاڑی ایک پل کے ذریعے سڑک کے اوپر سے گزرتی ہے اس لئے اسٹیشن کا منظر کسی پرانی انگریزی فلم کے سین جیسا لگتا ہے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان کھمبے سے لگا گول گھڑیال، دیوار سے لگے پڑے ہوئے لکڑی کے بینچ، سلیٹی پتھروں کا فرش، نیلے

رنگ کے بورڈ پر ٹرینوں کے آنے جانے کے اوقات اور صرف دو متوازی پٹریاں،
ایک شہر کے مرکزی علاقے کی طرف جاتی ہوئی اور دوسری مرکز سے حاشیے کی طرف
آتی ہوئی دونوں طرف کے پلیٹ فارموں پر اکا دکا مسافر۔'' (۱۰)

سفر نامہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس میں سیاح دوران سفر پیش آنے والے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات کو بھی جگہ دیتا ہے جن کو پڑھ کر قاری ذہنی سکون حاصل کرتا ہے نجیبہ عارف نے جن ممالک اور جن شہروں کا سفر کیا ان کے بارے میں محض قیاس آرائی یا کتابی علم کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ ان کی زمانہ شناس نگاہیں ان لوگوں شہروں اور ملکوں کے بارے میں ایسے حقائق بیان کرتی ہیں جن کا علم کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں مثلاً کوریا میں جا کر نجیبہ عارف کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا یہی رواج ہے کہ پوری کی پوری قوم چھ بجے کھانا کھا کر فارغ ہو جاتی ہے اور ڈرائیور سے لے کر ڈائریکٹر تک سب ایک ہی کاؤنٹر سے قطار میں لگ کر کھانا حاصل کرتے ہیں اور وہ جگہ جگہ پاکستان سے موازنہ کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔

''ان کی سماجی زندگی کا یہ پہلو خاص طور پر قابل داد ہے بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایسی
مساوات کا ابھی تک رواج نہیں ہو سکا اس پر بھی ہمیں اس نبی رحمت ﷺ کے امتی
ہونے کا دعویٰ ہے جس نے انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات مٹا
ڈالنے کا برملا اعلان کیا تھا مگر ہم ہیں کہ انہی امتیازات کا تمغہ بنا کے سینے سے لگانے
میں فخر محسوس کرتے ہیں۔'' (۱۱)

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو یہ قوم ان اقوام کے مقابلے میں زیادہ پُر اعتماد اور باصلاحیت ہے اور ان کے باشندوں خاص طور پر نوجوان نسل نے زندگی کے ہر میدان میں اپنی بے مثال لیاقت کا لوہا منوایا ہے لیکن پھر بھی احساس کمتری ہے جو اسے دنیا کی دیگر اقوام کے مقابلے میں آگے بڑھنے سے روک رہا ہے نجیبہ عارف کے مطابق یہ مشرق والوں کی غلامانہ ذہنیت ہے جو انھیں پیچھے دھکیل رہی ہے نجیبہ عارف کو یورپ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں ایشیاء خصوصاً پاکستان کی پسماندگی اور بھی زیادہ کھٹکتی ہے انھیں اپنا ملک اور مسائل یاد آنے لگتے ہیں اسی لئے نجیبہ عارف ایجادات اور ٹیکنالوجی کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔

''یونی ورسٹی کے ارباب اختیار کو اپنے اسٹاف اور طالب علموں کے بارے میں مسلسل معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بھی ان کے پاس ہے کون کس وقت یونی ورسٹی میں داخل ہوا، کتنے بجے لائبریری میں گیا، کتنے کاغذ پرنٹ کیے، کتنے صفحات فوٹو کاپی یا سکین لئے گئے چنانچہ یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس نے سکین لئے، ایک طرف تو افراد کو سہولت فراہم کرنے کی ذمہ داری پوری ہوتی ہے اور دوسری طرف انتظامیہ کو اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں آسانی ہوتی ہے............مگر میرے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جب عملی طور پر ایسی کوئی صورت پیش آئی ہو بلکہ یونی ورسٹی کے ہر درجے کے سٹاف کا مجموعی طور رویہ بھرپور تعاون اور باہمی امداد کے اصول سے مزین نظر آیا''۔ (۱۲)

زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ان کی معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے کہ وہ موقع اور حالات کی مناسبت سے اپنی معلومات کا رخ موڑ لیتی ہیں لیکن ان کے سفرنامے پڑھتے ہوئے کہیں بھی رکاوٹ یا دشواری کا سامنا نہیں ہوتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معلومات سفرنامے کی فطری روانی میں جذب ہوتی جا رہی ہیں اور قاری بغیر کسی اکتاہٹ اور بوریت کے ان معلومات کو اپنے حافظے میں سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

نجیبہ عارف شاعرہ اور ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علم دوست انسان بھی ہیں اس عالمی سطح پر ادب کے بدلتے ہوئے تناظر کو بھی نظر میں رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجیبہ عارف فطری سیاح ہیں ان کا سفرنامہ تو ذاتی نوعیت کا ہے نہ ہی سیاسی اہمیت کا حامل، بلکہ وہ ایسی سیاح کے روپ میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو اپنے اردگرد کے لوگوں سے بے تکلفانہ گفتگو کرنا جانتا ہے نجیبہ عارف نے دوران سفر جن بھی شخصیتوں سے ملاقات کی ان سے صرف ملنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ایک عام آدمی کے خیالات وجذبات کو بھی فوقیت دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جن بھی لوگوں سے ملاقات کی جو لوگ بھی ان کے آس پاس رہے ان کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے۔ مثلاً

''کنگ کیاؤ نیشنل یونیورسٹی آف لاؤس میں لاؤ زبان وادب کی استاد تھی وہ بیالیس برس کی تھی چھوٹے سے قد کی گول مٹول اور بالکل چپٹی ناک والک کنگ کیاؤ سرتاپا

ممتا ہی ممتا تھی اس سارے قیام کے دوران اس نے سب سے کم باتیں کیں مگر کہیں
بھی ہمیں خود سے الگ محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی شخصیت میں ایک نیک نفیس گھریلو
عورت کی دھیمی دھیمی حرارت تھی جو الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ خاص طور پر میرے
لیے اس کے دل میں ایسا گداز پیدا ہو گیا تھا کہ بغیر کچھ کہے مجھے اس کی شفقت اپنے
اردگرد محسوس ہوتی تھی۔'' (۱۳)

کوریا کے سفر کے دوران ان کی ساتھی بیلنڈا جو فلپائنی تھی اس سے ملاقات ہوئی بیلنڈا اسے اپنے ملک کے بارے میں دہشت گردی کے حوالے سے تاثرات سن کر نجیبہ عارف کا سر احساس ندامت سے جھک گیا اور ان کا احساس قومیت ہی ہے جو شدید حالات اور اپنی حاضر دماغ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنے ملک کے بارے میں بدگمان نہیں ہونے دیا اور نجیبہ عارف نے اپنی تمام تر حسیات کو استعمال کر کے اسے اپنے ملک کے بارے میں آگاہ کیا اور اسے اس بات پر قائل کیا کہ کسی بھی ملک میں ہونے والی دہشت گردی میں پوری قوم تو شامل نہیں ہوتی۔ ہر قوم کی اپنی ایک تہذیبی شناخت ہوتی ہے جو اسے دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں اور بعض پہلو انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وہ انفرادیت ہے جس کی بدولت اقوام عالم میں ہر قوم اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھتی ہے اردو سفر ناموں کی اپنی تہذیبی اور تمدنی اہمیت مسلّم ہے۔ بقول ڈاکٹر صدف

''سفر ناموں سے بہت سے ایسے واقعات اور حالات کا علم ہوتا ہے جو عام کتابوں
میں نہیں ملتے۔ ان حالات و واقعات اور تہذیب و معاشرت کو ایک سیاح اپنے نکتہ
نظر سے پیش کرتا ہے اور اپنے عہد کی خاص تہذیب، شادی بیاہ، لوگوں سے رسم و
رواج کو سفر ناموں میں اس انداز سے پیش کرتا ہے جو عام تاریخی کتابوں میں نہیں
ملتے''۔ (۱۴)

نجیبہ عارف نے اپنے سفر ناموں میں اپنی قوت مشاہدہ سے کام لیتے ہوئے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے تمام مناظر کا تجزیہ کیا ہے اور پھر انھیں بیانیہ انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے وہ صرف خارجی مناظر کے حسن میں ہی نہیں کھو جاتیں بلکہ وہ ان مناظر کے پس پردہ حقائق سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر ناموں میں

صرف جگہوں کا ہی بیان نہیں ہوتا بلکہ وہ وہاں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن مکانات کی تعمیر، آرائش و زیبائش الغرض پورے منظر کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی ہیں۔

''اوپر کی منزل پر چھوٹے بڑے کئی کمرے ہیں جوان دنوں کلاس روم کے طور پر کام آرہے تھے اس عمارت کے سامنے باسکٹ بال کا کورٹ ہے دائیں طرف چند سڑھیاں اتر کر بے حد وسیع وعریض گراؤنڈ ہے جس میں ایک طرف فٹ بال کا کورٹ ہے اور دوسری طرف سکواش کا...... بائیں جانب ذرا آگے بڑھیں تو گھاس کے خوبصورت قطعات کے درمیان سے ہوتے ہوئے آپ ایک فرخ پھتر یلے زینے تک پہنچ جاتے ہیں......زینہ ختم ہوتے ہی بائیں ہاتھ ایک جیسی عمارتیں نظر آتی ہیں ان میں سے ایک والنٹیر لڑکیوں کا ہاسٹل ہے اور دوسرا لڑکوں کا......''(۱۵)

نجیبہ عارف کا کوریا اور لندن میں قیام کے دوران دوسرے ممالک سے آئے ہوئے لوگوں سے بھی واسطہ پڑا اور اندازہ ہوا کہ ہر مذہب اور عقیدے سے تعلق رکھنے والوں کا اپنا نظریہ زندگی ہوتا ہے جس کی روشنی میں افراد اور ان کی پوری زندگیوں کا خاکہ مرتب کیا جاتا ہے۔نجیبہ عارف خوراک کے معاملے میں بھی خوش و ذوق واقع ہوتی ہیں۔اس لئے اچھے کھانے کی تعریف بھی کرتی ہیں یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ کھانا صرف ہماری جسمانی ضرورت اور بھوک کا مداوا ہی نہیں کرتا بلکہ عمدہ کھانا ہمارے ذوق و جمالیات کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔لیکن نجیبہ عارف کو کوریا کے کھانے بے ذائقہ اور بے مزہ لگے۔

''دوپہر کے کھانے پر ابلے ہوئے چاول جو یہاں کی معمول کی خوراک ہے نوڈلز اور سبزیاں اور فرائیڈ چکن مگر سب کے سب بے ذائقہ، نمک نہ مرچ......کورین لوگ ہر کھانے کے ساتھ کم چی کھانے کے عادی ہیں جو ان کے حساب سے بہت سپائسی ہے مگر وہ بھی پھیکی اور بے مزا ہے لیکن غذائیت کے اعتبار سے البتہ کورین کھانے لاجواب ہیں۔'' (۱۶)

سفر نامہ لکھتے ہوئے جو چیز سب سے زیادہ سفر نامے کے متن کو متاثر کرتی ہے وہ ہے سیاح کا طبقاتی تعلق

سیاح کا تعلق جس طبقے کے لوگوں سے ہوگا وہ اسی طبقے کے لوگوں اور ان کے معیار زندگی کا مطالعہ بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ کسی بھی سفر نامے کو پڑھنے کے بعد قاری کے لئے سماجی رتبے کا یقین کرنا مشکل نہیں کیونکہ سیاح کی دلچسپیاں اور پسند و ناپسند ہی اس کے معیار زندگی کا تعین کر دیتی ہیں۔ نجیبہ عارف کے سفر نامے پڑھنے کے بعد ان کا سماجی رتبہ قاری کے سامنے خود بخود متعین ہو جاتا ہے۔ کسی بھی نئے ملک علاقے میں جا کر سیاح کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ وہاں کے موسمی اثرات، اس لئے ایک سیاح پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا سفر شروع ہونے سے قبل اجنبی ممالک اور علاقوں کی آب و ہوا اور موسم کے متعلق درست معلومات حاصل کر لے تاکہ دوران سفر کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے ان معلومات کے ضمن میں سفر نامے بہترین ماخذ ہوتے ہیں اور ایک سیاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا کہ وہ گزشتہ سیاحوں کے تجربات سے استفادہ کرے۔

نجیبہ عارف کے سفر ناموں میں سب سے اہم چیز حقیقت کا بیان ہے وہ اشیاء اور مناظر کو جیسا دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں ویسے ہی بیان کر دیتی ہیں اس ضمن میں انھوں نے اپنی ذات کو بھی قابل گرفت نہیں رہنے دیا نجیبہ عارف کے سفر نامے پڑھ کر ایسے سیاح کا خیال ذہن میں آتا ہے جو دوران سفر شعور، لاشعور اور تحت الشعور تینوں دنیاؤں میں متحرک اور فعال رکھتا ہے شعور انسانی ذہن کا وہ حصہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتحال سے باخبر رہتا ہے جبکہ لاشعور میں روزمرہ پیش آنے والے وہ تجربات و مشاہدات جو پس پشت چلے جاتے ہیں محفوظ ہوتے ہیں اور تحت الشعور انہی تجربات و کیفیات کا کچھ حصہ مخصوص وقت کے لئے اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ نجیبہ عارف کے سفر ناموں میں ذہن انسانی کے یہ تینوں حصے بیک وقت متحرک نظر آتے ہیں۔ نجیبہ عارف کے سفر ناموں کی معلوماتی اہمیت مسلّم ہے ان کی معلومات کا دائرہ لامحدود ہے الغرض نجیبہ عارف کے سفر ناموں میں تجربات و مشاہدات اور علوم و فنون کا اُمڈتا ہوا دریا ہے جن سے ہر ذہنی سطح کا قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ نجیبہ عارف نے اپنے سفر ناموں کا تمام تر مواد حقیقی زندگی سے لیا ہے اگر چہ ادب کی دیگر اصناف بھی زندگی اور اس کے مظاہر کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں مگر ان میں زندگی کو اس کے تمام تر حقائق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا بلکہ داستان طرازی کے لئے ان میں تخیلاتی عناصر شامل کر دیے جاتے ہیں اگر چہ نجیبہ عارف کے سفر ناموں میں بھی بعض مقامات پر انسانیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن اگر مجموعی طور پر ان کے دونوں سفر ناموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں زندگی اپنی تمام

خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے نجیبہ عارف نے زندگی کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ اپنے سفرناموں میں عیاں کیا ہے۔نجیبہ عارف کے سفرناموں میں تشبیہات واستعارات اور گانوں اور شعروں کا لفظوں کے صوتی آہنگ سے بھی ہمکنار نظر آتے ہیں یوں الفاظ اپنے وجود میں اپنے مزاج کا پتہ خود دیتے ہیں:

''ربّا گوریاں نو قید کرادے''

''کالیاں داحق ماردے'' (۱۷)

''دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھو پڑا ہو''۔ (۱۸)

''اگے تیرے بھاگ لچھیے'' (۱۹)

نجیبہ عارف کے ہاں منظرکشی بے روح نہیں بلکہ ان کی آنکھ مناظر کو جس زاویے سے دیکھتی ہے اسے اپنے اندر جذب کر کے تخلیق کی روح سے آشکار کرتی ہے گویا وہ منظرکشی میں بصیرت اور بصارت دونوں حواس سے کام لیتی ہیں ان کے یہاں منظرکشی کا ایک اور زاویہ یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ مناظرہ کا حقیقی حسن اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

> ''سامنے سکرین لگی ہے، ہیڈ فون گود میں رکھے ہیں گھٹنوں پر کمبل ہے گردن کے نیچے تکیہ ہے، بے شمار فلموں، ٹیلی ویژن پروگراموں اور دنیا بھر کی خبروں میں سے کسی کا بھی انتخاب کرنے کی آزاد ہے......وہ سامنے بیت الخلا بھی ہے نشست کی جیب میں رنگین رسالہ بھی رکھا ہے۔'' (۲۰)

نجیبہ عارف کے سفرناموں کا اسلوب بیانیہ ہے تاہم کئی مقامات پر بیانیہ انداز کی بجائے معاملات زیادہ تر مکالمات کے ذریعے طے پاتے ہیں اور نجیبہ عارف کی یہ دلچسپ مکالمہ نویسی درحقیقت ان کے سفرناموں کی پہچان ہے ان مکالماتی انداز کی بدولت نجیبہ عارف نے قاری پر ایسی ایسی باتیں آشکار کی ہیں جن کا اظہار بیانیہ اسلوب میں ممکن نہیں تھا۔

''یہاں کیوں آئی ہیں؟

ریسرچ کرنے

کہاں؟

لندن یونیورسٹی میں

اور رہیں گی کہاں؟

میں نے پتا بتایا۔

کس موضوع پر ریسرچ کر رہی ہیں؟

سفرنامے۔۔۔۔۔۔مغرب کے۔(۲۱)

نجیبہ عارف کے سفرناموں میں جتنے بھی کردار سامنے آئے ہیں ان کا تعلق ہمارے گردوپیش کے ماحول سے ہے وہ ان کرداروں کو اپنے سفرناموں میں جزوی طور پر شامل نہیں کرتیں بلکہ یہ کردار اپنی مخصوص فطرت اور ذہنیت کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور سفرنامے کے متن پر ان مٹ نقوش چھوڑتے ہیں دراصل نجیبہ عارف کو یہ بات بالکل بھی گوارا نہیں کہ وہ اپنے سفرناموں میں آنے والے کرداروں کے بارے میں کوئی الجھن قاری کے ذہن میں رہنے دیں اس لیے موقع ملتے ہی مذکورہ کرداروں اور شخصیات کا مکمل تعارف پیش کر دیتی ہیں۔

''عبد با سینی گال سے آیا تھا سینی گال مغربی افریقہ کا مسلمان اکثریت پر مشتمل ملک ہے جہاں کے باشندے افریقی آب و ہوا اور موسمی اثرات کے نتیجے میں سیاہ چمکدار رنگت اور مخصوص تہذیب و ثقافت کے مالک ہیں عبد با عموماً ایک سفید لمبے سے گاؤن نما چغہ میں ملبوس رہتا جس میں اس کی آبنوسی رنگت اور بھی نمایاں ہو جاتی۔'' (۲۲)

نجیبہ عارف کے سفرناموں میں حسن بیان اور حسن کلام کا جو تناسب موجود ہے وہ اپنی مثال آپ ہے یہ توازن ہیت اور تکنیک میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہے اور اسلوب اظہار میں بھی ان کے کرداروں کا تعلق جس بھی شعبہ زندگی سے ہوتا ہے وہ اسی کے مطابق گفتگو کرتی ہیں اس لیے ان کے سفرناموں میں کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سفرنامہ نگار اپنی علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔نجیبہ عارف کے لہجے میں خود کلامی کا انداز بھی نمایاں ہے وہ اپنی ذات کے اندر ان تمام پہلوؤں کو سامنے لے کر آئی ہیں جو وہ صرف سوچنے پر اکتفا ہی نہیں کرتیں بلکہ اس سوچ کو انہوں نے خوبصورت الفاظ کے پیرائے میں بھی سمویا ہے۔

''مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ ہم ذات بھی بغیر ٹکٹ، بغیر ویزے کے، میرے ساتھ محوسفر ہے جس سے میری کبھی نہیں بنی وہ دشمن جو میرے ساتھ ساتھ میرے اندر ہی کہیں پلتا بڑھتا رہا ہے جس نے میری زندگی عذاب بنا رکھی ہے یہاں بھی ڈھٹائی سے مجھے جھانک رہا تھا۔''(۲۳)

نجیبہ عارف کے سفرناموں کو پڑھ کر ان کے بیان کی سچائی قاری کو بہت متاثر کرتی ہے ادب میں کسی بھی تحریر کی سچائی جرأت اظہار کا تقاضا کرتی ہے اور نجیبہ عارف ایک سچی، کھری فنکارہ ہیں اس لیے وہ اپنی تحریروں میں جرأت مندانداز سے سچائی کو بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ صرف اپنے گردوپیش کے حقائق کو ہی صاف گوئی سے بیان نہیں کرتیں بلکہ جب وہ اپنی ذات کا محاکمہ کرتی ہیں تو ان کے لہجے کی صاف گوئی برقرار رہتی ہے۔

نجیبہ عارف چونکہ بنیادی طور پر ایک شاعرہ بھی ہیں اس لیے ان کے شاعرانہ مزاج کی خصوصیت ان کی نثر میں بھی تحلیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے نجیبہ عارف کے سفرناموں میں سیاح اور قاری ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اس لیے ان کے قلم اور تحریر میں یکسانیت پائی جاتی ہے دوران سفر وہ قاری کو ہر قسم کے تجربات ومشاہدات سے بالواسطہ طور پر آگاہ کرتی جاتی ہیں۔ نجیبہ عارف کے سفرنامے پڑھتے ہوئے ان کا ذوق جمالیات بھی قاری کو متاثر کرتا ہے ان کے سفرناموں میں مناظر ہمیشہ متحرک رہتے ہیں دوران مطالعہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے مناظر اور واقعات کی ایک فلم چل رہی ہے جس میں ہر منظر تھوڑی دیر کے لیے ابھرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے یہی تحرک اور روانی نجیبہ عارف کے اسلوب کا بھی خاصہ ہے کہ وہ روانی اور تسلسل سے اپنے سفرنامے کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔

نجیبہ عارف جہاں بھی اپنے سفرناموں میں منظر کشی یا جزئیات نگاری سے کام لیتی ہیں وہیں وہ سفرنامہ نگاری کی تکنیکوں کو بھی نظر میں رکھتی ہیں وہ اپنے سفرناموں میں جزئیات نگاری یا منظر کشی کرتے ہوئے جب کسی واقعہ ماحول یا مخصوص صورتحال کو پیش کرتی ہیں تو اسکی واضح تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہیں وہ کسی بھی شے کو چھوٹا یا بڑا سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتیں نجیبہ عارف ایک وسیع النظر شخصیت ہیں اس لیے انکے نزدیک کوئی بھی واقعہ یا بات معمولی اور حقیر نہیں ہوتی۔ انکے سفرناموں میں کہیں بھی پر تکلف پیرائیہ بیان نظر نہیں آتا بلکہ انھوں نے زبان کی

سادگی، جملوں کی مخصوص بناوٹ، تصنع اور پرآسائش انداز بیان سے گریز کر کے عام فہم انداز بیان کو اپنایا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف بحیثیت شاعرہ:

ڈاکٹر نجیبہ عارف عہد حاضر کی معروف نقاد، محقق، معلم تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت اعلی درجے کی شاعرہ بھی ہیں ان کی بہت سی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں انہوں نے شاعری میں فنی مہارت اور فکری چابکدستی کا اظہار کرتے ہوئے انداز بیان کے نئے اسالیب اپنائے ہیں ڈاکٹر صاحبہ کا میلان آغاز سفر میں شاعری کی طرف ضرور رہا لیکن انکی شاعری سے محبت اگرچہ بچپن سے ہی ہے لیکن تحقیق وتنقید کو اپنائے رکھا انہی دومیدانوں میں برتری اور فضیلت حاصل کی ''معانی سے زیادہ'' ڈاکٹر نجیبہ عارف کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو شہرزاد گلشن اقبال کراچی سے جولائی ۲۰۱۵ میں شائع ہوا اور ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ہے آغاز میں حافظ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

شب تارا است ورہ وادی ایمن درپیش

آتش طور کجا ، وعدہ دیدار کجا ست

ڈاکٹر نجیبہ عارف بنیادی طور پر ادبی شاعرہ اور محقق ہیں ان کے موضوعات میں رنگارنگی ہے لیکن احساس کی شدت ہر قدم پر ہے جدید زندگی کی ترقی ہو یا اس کے نتیجے میں ہونے والی انسانی اقدار کی توڑ پھوڑ کے خلاف ردعمل کا رویہ انہوں نے اظہار کے لئے کوئی ایک سانچہ نہیں بنایا بلکہ تنوع یہاں بھی ان کا خاصا رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ رومانیت کے ہلکے سائے بھی ہیں۔

شاعر جدید زندگی اور طرز حیات کو اپناتے ہوئے بھی اس زندگی کی منفی جہتوں سے بے زار نظر آتا ہے تصنع اور بناوٹ سے نفرت، سادگی وحقیقت سے محبت شاعر کے کلام کی ہر سطر میں، ہر مصرعے کی میں جاری وساری ہے ''معانی سے زیادہ'' کی منظومات اور قطعات میں معنوی وسعت بھی ہے اور عصری سیاسی شعور کا بیان بھی ذات اور خدا سے مکالمہ بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے غزل پر بھی طبع آزمائی کی ہے ان کی غزلیات محبت، تنہائی کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہیں جن میں رنگارنگی کے ساتھ لطیف پیرائے میں دل کی واردات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات میں

ڈوب کر اشعار کہے ہیں اور اس لیے کہے ہیں کہ ایسا کہے بغیر وہ رہ نہ سکتی تھیں انہوں نے شعر کی بہت سی اصناف کو اظہار ذات کے لئے استعمال کیا ہے۔

''معانی سے زیادہ'' کی منظومات اور قطعات اپنے احتصار کے باوجود معنوی گہرائی کے حامل ہیں۔ان میں معاشرے کے رجحانات اور بدلتی قدروں کا غم بھی ہے اور یہی روانیت ان کے فن کو پختہ کرتی ہے تشبیہات میں زندگی و حرارت رواں دواں ہے ان کے پردے میں جھلملاتے ہوئے کئی پیکر ابھرتے ہیں جو قصے تو سنانے میں آواز دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور قاری کے ساتھ مل جاتے ہیں شاعر کی رومانویت اس کے فن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

چڑھتا سورج، گھٹتے سائے
یادوں کی گم نام سرائے
ایسے میں اب کون بلائے
پتی صبحیں جلتی شامیں
ہولے ہولے ڈھلتی شامیں
چاند یہ اجلا من کو جلائے
سلگی لگی یادیں اپنی
سلگی سلگی باتیں اپنی
پیار کی شبنم کون گہرائے (۲۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے''معانی سے زیادہ'' میں متنوع موضوعات کو اپنایا ہے انھوں نے بیشتر نظم کی صنف کو اختیار کیا ہے اور کچھ نظموں میں ان کی فکر کا محرک معاشرہ اور اس کی رنگا رنگ نفسیات و کیفیات ہیں اس موضوع کی ادائیگی ایسے ہی جامع انداز میں کی جاسکتی ہے نظم کے تسلسل نے ڈاکٹر صاحبہ کی مدد کی ہے انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نظم کے سانچے کو اپنایا ان کے ہاں بے ساختہ اظہار بھی اور اداسی بھی، تنہائی بھی ہے اور تخیل کی فراوانی بھی، ان کے کلام میں جذبات کی فراوانی اور ماضی پرستی کا عنصر بھی ملتا ہے۔

تم نے میرے کمرے میں روزن چھوڑ دیے تھے

تا کہ جنگل کی آواز مجھے پکارتی رہے
اور میری مزاحمت دم توڑ دے
تم نے میرے پاؤں کی زنجیریں کھول دی تھیں
رقص کی لے تیز کر دی تھی
مگر میں نے اپنے پیروں کو کیلوں سے گاڑ دیا
اور تمہارے فرش سے چمٹی رہی (۲۵)

ڈاکٹر نجیبہ عارف پر گو لیکن بلند معیار برقرار رکھنے والی شاعرہ ہیں ان کے ہاں ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جہاں دکھ درد کی پرچھائیں ہیں وہیں امید کی کرن بھی ہے مایوسی ان کی شاعری میں موجود نہیں ہے کیونکہ یہ کیفیت انسانی اعصاب کو شل کر دیتی ہے اور آئندہ کسی بڑے مقصد کی تکمیل سے روکتی ہے۔

میری روح میں چند گرہیں لگی ہیں
کچھ ایسی بندھی ہیں کہ چاہوں بھی تو کھول پاؤں نہیں
میری آنکھ میں چند منظر بسے ہیں
کچھ ایسے کھدے ہیں
جھٹکتی ہوں جتنا، وہ اتنے ہی گہرے اتر جاتے ہیں
دل کی تختی پہ ایسی بھی تحریریں ہیں
جن کو پڑھنا کسی کو نہ آیا کبھی
سوچ کے دائروں میں کہیں ایک نقطہ ہے
جو دوسروں سے الگ ہے ...... ذرا فاصلے پر
وہاں جا کے رک جاتی ہے زندگی (۲۶)

''سورج کے پجاری'' اور ''لال مسجد'' میں شاعرہ کا طرز فکر مثبت اور امید افزا ہے اور وہ غم کے اندھیرے میں زندگی تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں جیسا کہ پہلے تعارف میں بھی بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ ہمہ پہلو

شخصیت ہیں ان کے ہاں ہمیں ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں اور یہ تمام روایات ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مزاج و شخصیت کی خاصہ ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی نظم ''معطل عہد کا روزمرہ'' میں معاشرے کے حالات کو مکالماتی انداز میں بیان کیا ہے ان میں مکالمہ بھی ہے حرکت کرتے ہوئے کردار بھی مکالمے کا یہ تاثراتی انداز ان کی نظموں کا انوکھا پہلو ہے جو ڈاکٹر نجیبہ عارف کو ایک کامیاب ڈارمہ نگار بنا دیتا ہے

امی ، مجھے دو دن سے بخار ہے
ڈاکٹر کے پاس چلیں
صبر کرو بیٹا
میں پیسے جمع کر رہی ہوں
شاید اگلے ماہ تک ڈاکٹر کی فیس ہو جائے
لیکن امی! ہم پولی کلینک یا پمز کیوں نہیں چلے جاتے؟
وہاں تو ڈاکٹر کی فیس بھی نہیں دینی پڑتی
بیٹا! وہاں ایمرجنسی نافذ ہے (۲۷)

یہ نظم ڈاکٹر نجیبہ عارف کی مکالماتی نظموں میں سے ایک عمدہ مثال ہے جو خود کلامی کے ذریعے اپنے کردار کے عناصر کو اجاگر کرتے ہوئے نظر آتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ کی نظموں میں گفتگو کے عناصر سے خطابیہ شاعری وجود میں آتی ہے جس میں صوتیات کو نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

میں صدیوں سے یونہی،
گھٹنوں پہ اک ٹوٹا ہوا آئینہ رکھتے،
ایک انجانے تحیر میں گھری
آدھی، ادھوری، ٹوٹی پھوٹی
جابجا تڑخی ہوئی،

گم صم کہیں بیٹھی ہوئے ہوں!!! (۲۸)

ایسی اور بھی خود کلامی انداز میں انہوں نے نظمیں تخلیق کی ہیں خود اذیتی کا پہلو بھی کہیں کہیں جھلکتا ہے لیکن ڈاکٹر نجیبہ عارف کی رجائیت زندگی سے محبت بن کر ابھر آتی ہے۔

''معانی سے زیادہ'' ڈاکٹر نجیبہ عارف کے قلب و روح پر گزری واردات کا منظوم بیان ہے، اسی لیے اس میں صداقت اور واقعیت ہے وہ اپنی ذات میں گم ہو کر اشعار کہتی ہیں اور ذاتی احساسات اور تجربات کو ہمارے سامنے بیان کرتی ہیں انہوں نے اپنے فن کی عظمت کی بدولت داخلی تجربات کو بیرونی دنیا کی واردات بنا دیا ہے یہاں پہنچ کر ذات اور کائنات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی صداقت بیان محض معنی کی سچائی بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ ان کو بھی وہی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

زندگی!

اے زندگی!
یہ کون ہے تیرے تعاقب میں
پچھل پیری
کہ جسکی آنکھ سے وحشت کی ٹھنڈی ٹھار لہریں
یوں نکل کر
ہر گلی کوچے میں بھاگی پھر رہی ہیں
جیسے پورے شہر پر دیونگی کا راج ہو!!!
وہ لفظ، باتیں اور خیال
لوگ جنہیں بے معنی کہتے ہیں
ایسے خالی برتن ہیں
جن میں ڈالنے کے لئے
ان کے پاس کوئی معنی نہیں ہوتا! (۲۹)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے نزدیک شاعر معاشرے کا ستون ہے جو چاہے تو اخوت اور بھائی چارے کی فضا کو اپنے کلام کے ذریعے فروغ دے سکتا ہے ہمارے ملک میں فن کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے لیکن اس صورتحال کا انجام صرف موت اور بربادی ہے اس طرح روحانی، اخلاقی، معاشرتی اقدار دم توڑ جائیں گی۔

ہمارے پاس فقط خیال ہیں، کہانیاں نہیں
دھندلے سے کچھ منظر جو پلکوں کیا اوٹ میں لرزتے رہتے ہیں
کسی سچے خواب کا تسلسل نہیں بن پاتے
مبہم سے کچھ لفظ ، جن کے مفہوم منکشف نہیں ہوتے
بے یقین لہجے جو کچھ نہیں کہتے
بے اعتبار چاہتیں جو کڑوی دواؤں کی طرح پیے جاتے ہیں
بے درد دل جنھیں جعلی نوٹوں کی طرح دھوکے سے ایک دوسرے کو دے رہے ہیں
ہم زندگی کے یخ سے جمے ہوئے لوگ ہیں ...... سرد مزاج
ہم پو پھٹنے کا اندھیرا ہیں گہرا اور گھنا (۳۰)

تقسیم کے واقعات اور ہجرت نے ہر دور کے شعراً کو متاثر کیا میر تقی میر ہو یا ناصر کاظمی یا پھر ڈاکٹر نجیبہ عارف اس عمل نے ہر ایک کے قلب و ذہن پر گہرے اثرات اور نقوش ثبت کیے اور یہ عکس ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے تقسیم کے بعد عوام کے خوابوں کا چکنا چور ہونا ایسا عمل تھا جس نے بڑے بڑے شاعروں سے ان کا کلام تخلیق کرایا اس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی نظم ''سورج کے پجاری'' ہے اسی موضوع پر لکھی گئی ہے

وہ لاہور سے نکل کر پنجاب کے بطن میں گھس گئے اور ایک نیا جنم لے لیا
لیکن میرا قبیلہ امرتسر کو نہیں بھولا
مرنے والے پچھلوں کو کہہ کر گئے
کہ جب موقع ملے تو ہماری قبریں امرتسر لے جانا
وہ ابھی چھوٹے ہیں

اور نہیں جانتے کہ بے نام قبروں کا دکھ،

ہجر کا ورثہ

بے زمینی کا روگ کیسا ہوتا ہے

لیکن میری طرح انہیں بھی معلوم ہے

کہ خانہ بدوشی کی لذت ان سب سے بڑھ کر ہوتی ہے(۳۱)

''معانی سے زیادہ'' میں نظموں کے حصے میں جو نظمیں ہیں مثلاً تنہائی، بارش، محبت یہ ان کے ذاتی واردات کی داستان ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی نظموں میں بے شمار تجربے کیے ہیں ان کے کلام کی ڈرامایئت ان کی نظموں کے تجسس کو ابھارتی ہے ان کی نظمیں زندگی کا آیئنہ ہے اور ہر پرانا معنی نئے خیال کی عکاسی کرتا ہے اور قاری کو مبہوت کر دیتا ہے انکی نظمیں روانی سے بہتی چلی جاتی ہے اور ایک سلسلہ خیال سے جڑی ہیں یہ منضبط طرز ادا ایک طویل ذہنی اور تخیلی محنت کی مرہون منت ہے ایک شاعر کے تخیل کے یہ روپ حیران کن ہیں۔ کہیں تصنع کا شک نہیں ہوتا یہ ایک سلسلہ خیال ہے جو باہم مربوط ہے اردو زبان کو ڈاکٹر صاحبہ نے ایک اچھوتے انداز میں برتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ''معانی سے زیادہ'' میں جو بھی نظمیں، غزلیں لکھی ہیں وہ نہایت عمدہ ہیں اور فکر و فن کے معیار پر پوری اترتی ہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحبہ نے ایک خیال کو مسلسل بیان کیا ہے انکے موضوعات متنوع ہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی شاعری کو حقیقت کا رنگ دیا ہے۔ انسانی ذہن پر جس قدر اسکا ماضی حاوی ہوتا ہے اتنی کوئی اور چیز نہیں ہوتی ڈاکٹر نجیبہ عارف کی نظموں میں بھی ماضی کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے اور ان کی نظمیں ماضی کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی کو ظاہر کرتی ہے وہ ماضی جو لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا یہ استعارے عام فہم ہیں لیکن بڑے گہرے اور وسیع، شاعرہ نے اپنی یادوں کے تخلیقی لمحوں کی بازیافت بڑے کامیاب انداز میں کی ہے۔ مثلاً

وہ دن بھی کتنے عجیب تھے

ہوا کی انگلی پکڑ کے چلنے کی آرزو تھی

دھنک کے رنگوں چھو کے دیکھیں، یہ لو لگی تھی

ہر اک بگولے میں رقص کرنے کی تھی تمنا

خزاں کے پتوں کا پیچھا کرنے کی جستجو تھی

وہ دن بھی کتنے عجیب تھے (۳۲)

یہ ماضی پسندی رومانیت کا خاصہ ہے جہاں سرسراتے ہوئے ہلکے سائے بھی دکھائی دیتے ہیں یہاں شاعری کا کینوس اداسی کے رنگوں کے بغیر نامکمل ہے ان کی نظموں میں ادھورا پن بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ''پہیلی'' میں وہ اس طرح اس کی مثال دیتی ہیں۔

دو کمروں کا ایک مکاں میں

سارا جیون بیت گیا ہے

اک کمرے میں، میں رہتی ہوں

میں جو خود کو ''میں'' کہتی ہوں

کہیں سے کالی ، کہیں سے بھوری

کہیں مکمل، کہیں ادھوری

کہیں پہ خود کو پوری پوری

کہیں اضافی کہیں ضروری (۳۳)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ہاں جہاں زندگی کی افسردگی اس کی بے ثباتی کے جواز کو اپنا لیتی ہے اور وہاں یاس و افسردگی اس کے تلخ حقائق کی بازیافت بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی نظموں، غزلوں میں ہر رنگ کے اشعار اور موضوعات موجود ہیں ہر نظم کا موضوع ایک فریم میں سج کر ایک مکمل اور جامع تصویر کا روپ بن گیا ہے اس مہنگائی کے دور میں عوام جس چکی میں پس رہی ہے عوام کا ردعمل اور ان کے احتجاج کو بڑی خوبصورتی سے انہوں نے اپنی نظم ''زندگی کی لوڈ شیڈنگ'' میں بیان کیا ہے۔

شہ رگ کاٹ دی گئی

خود کو دھماکے سے اڑا لیا

تیزاب پھینک کر چہرہ مسخ کر ڈالا

سڑکوں پر ٹائر جلائے گئے

پتلے نذر آتش ہوئے

گلے میں پھندا ڈال کر خود کشی کر لی

ریلوے لائن جگہ جگہ سے اکھیڑ دی

معمولی سی بات پر تنازع ہوا اور دوست کو گولی مار دی

استاد اور شاگرد میں تلخ کلامی، نوبت گالی گلوچ تک جا پہنچی (۳۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف اردو الفاظ کو بڑی مہارت سے تصوراتی تخیل کے بل بوتے پر تخلیق کرتی ہیں اور اس عمل میں الفاظ ان کا ساتھ دیتے ہیں اور نئی تراکیب ڈھل کر معانی و بیان کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہیں ان کے مصرعے ڈھلے ہوئے اور لفظی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے کلام کی دلآویزی کا سبب تشبیہ و استعارے کی کشش ہے

''لکڑی کے گھوڑوں کی طرح اپنی جگہ منجمد'' (۳۵)

''شبِ بے خواب کی ہلکی گلابی آنکھ میں چبھتی'' (۳۶)

''اسے گیند کشتی یا راکٹ بنا کر'' (۳۷)

''معانی سے زیادہ'' کا فکری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں ڈرامائی انداز، خود کلامی، مکالماتی انداز، رومانیت اور معاشرتی طنز، تقسیم کے حوالے سے جذبات، حسن و محبت، اداسی و غم کی کیفیات، رجائی انداز یاس و آس محبوب کی جدائی جیسے متنوع موضوعات ملتے ہیں فنی سطح پر ''معانی سے زیادہ'' میں تغزل، موسیقیت، تمثال گری، مئوثر لفظیات کا استعمال شامل ہے ان کی شاعری قدیم و جدید کا خوبصورت آہنگ کا نمونہ بن کر سامنے آئی ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے ''معانی سے زیادہ'' میں متنوع موضوعات کو اجاگر کیا ہے سماجی زندگی، اپنی ذات کے حوالے سے نظمیں، نثری نظمیں اور غزلیں اپنے آپ میں مثال ہیں وہاں غزل جیسی ابدی اور کلاسیکی، صنف سخن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ انہوں نے اردو زبان میں شاعری کی ہے جو وسیع تر موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں

ان کے ہاں حسن وعشق کی کیفیات وصل وفراق کی داستانیں، ماضی کی یادیں عاشق کی ذہنی اورنفسیاتی کیفیات تمام تر فنی محاسن کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے ہاں محبت کی متنوع کیفیات ملتی ہیں جو روایات سے ہم آہنگ ہیں کبھی سوز والم کے پیرائے میں کبھی حسن و جمال کو سراہتے ہوئے۔

تو آئے تو میں جی اٹھوں ، بجے ، چھکے کھلے ، پھیلے،
مرا کنگن ، مری پائل ، مری سرخی ،مرا کاجل
جذبہء محبت سے سرشار ہو کر وہ یوں محبت کا اظہار کرتی ہیں
بہت تھک ٹوٹ کر آئے ہو دن بھر کی مشقت سے
چلو تم کو سلا دوں میں اڑھا کر پیا ر کا آنچل (۳۹)

اس اعتبار سے ان کی شاعری رجائیت، لطف انبساط کی شاعری ہے جذبے اس میں فکر کی کارفرمائی ہے خوشی اورغم دونوں کے اظہار میں تناسب اور توازن موجود ہے انکے ہاں وصل کا خوشگوار بیان تو ہے مگر رجائی شاعرہ ہونے کی بناء پر ہجر کی تکلیف دہ باتوں کو فراموش کر دیتی ہیں۔

اک ہجر کی بستی ہے جو آباد ہے دل میں
اس ہجر کی بستی میں کہاں کوئی رکا ہے(۴۰)

ان کے کلام میں خود کلامی بھی ہے جو تنہائی کو ختم کرنے بازگشت ہے۔

نہیں نہیں ، ابھی نہیں ، ابھی نہیں ، کبھی نہیں
یہ ہے بے حسی کی سرمئی ردا مجھے سجی نہیں
ابھی تو دل کی راکھ میں بھی آگ ہے دبی ہوئی
ابھی شرار آرزو کی روشنی تھمی نہیں(۴۱)

انہوں نے غزل میں تجربے کی تفصیلات پیش نہیں کیں بلکہ اسکو روح میں شامل کرلیا ہے اسطرح قاری بھی

انکے ساتھ شامل ہو جاتا ہے یہ عناصر صرف غزلیات میں ہی نہیں بلکہ انکی نظموں میں بھی ملتے ہیں ان کی شاعری کا انداز اس قدر انوکھا ہے کہ فکری سطح پر ان کو پختگی عطا کرتا ہے اور انکی بصیرت کو نئے حقائق سے ہم آہنگ کر دیتا ہے جدید طرز احساس کے ساتھ ساتھ جدید دور کے استعارے ملتے ہیں۔ان کے کلام میں جذب و سرور بھی ہے اور فکر کے مختلف پہلو بھی تناسب وتوازن نے ان کے کلام کو ایک الگ شان عطا کر دی ہے ان کا کلام زبان و بیان کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہے موضوعاتی اعتبار سے ان کی غزلیات میں حسن وعشق کی کیفیات مثلاً فراق، رنج والم، وصال اور عاشق کی بے بسی سب کیفیات کا تذکرہ بڑے موثر اور مکمل انداز میں ملتا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف تفکر اور استدلال کی قائل ہیں شاعری ان کے سوالوں کے جواب مہیا کرنے کا ذریعہ ہے وہ زمانے اور وقت کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کو ارتقاء کا نام نہیں دیتیں بلکہ وقت ان کے نزدیک طاقت کا مظہر ہے ان کے ہاں وقت ایک تسلسل کا نام ہے

جبین فلک پر دمکتے ستارو
یونہی جگمگاتے ہو
یا دیکھتے ہو دنیا میں کیا ہو رہا ہے
سر کوہ آکر اُمڈتی گھٹاؤ!
یہ طوفان آہ و فغاں ایک عادت ہے
یا کچھ سمجھتی بھی ہو تم
پلٹتے ہوئے موسموں کی بہارو!
کسی کھوج میں ہو
کہ یونہی فقط دائروں کے سفر میں بندھی ہو (۴۲)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے اندر کی شاعرہ ان کی تمام حسیات کو بیدار رکھتی ہیں ان کی سوچ کو نہ صرف وسعت بلکہ نزاکت خیال بھی عطا کرتا ہے کسی بھی قسم کا موضوع ہو ڈاکٹر نجیبہ عارف ہر موضوع پر یکساں قلم اٹھاتی ہیں اور قلم کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ڈاکٹر صاحبہ کا وسیع ذہن ہے مطالعہ کی رفعت اور رنگا رنگی ہے اپنی مذہبی روحانی اور اخلاقی اقدار

سے محبت ہے جو ہر قدم پر ان کے قلب و ذہن کو جلا بخشتی ہے۔ وہ شعوری طور پر نظموں کے لئے ایسی تکنیک کا انتخاب کرتی ہیں کہ قاری کو دعوتِ فکر دیں ان کے جذبات کا اظہار ثابت ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ کا تصور غم رجائی انداز سموئے ہوئے ہے اس غم میں تخلیقی قوت بھی ہے عصر حاضر سے گہری وابستگی اور شعور بھی ہے ان کے ہاں غم اور اذیت کا اظہار تو ہے لیکن امید کی ہلکی اور مدہم سی لہر بھی اس غم کے دریا کی تہہ میں موجزن ہے

میں لال مسجد کے زیرِ سایہ کھڑی ہوتی ہوں یہ جانتی ہوں
کہ ان جگہوں پر امیر گاہک کا ملنا مشکل ہے
لیکن ایف سیکس کیسے جاؤں ابھی جو نکلی تھی گھر سے ننھی تڑپ کے
ایسے لپٹ گئی تھی کہ اس کو خود سے چھڑانا مشکل تھا
جلدی جلدی میں میری چپل کی ایک دوری بھی کٹ گئی ہے ازار بند
کے تحیف دھاگے سے اس کو بلند تو ہے
سکت بھی اتنی نہیں رہی ہے مشقتوں کی بھی عمر ہوتی ہے (۴۳)

غزل کسی بھی شاعر کی لطیف ترین کیفیات اور روایات کا لطیف پیرائے میں اظہار ہے ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی غزلیات میں فنی و فکری سطح میں کمی نہیں آنے دی روایات کے راستے پر چلتے ہوئے تمام تر صنائع بدائع استعمال کرتے ہوئے اس صنف کو اپنایا اور پھر بام عروج تک پہنچایا ہے ڈاکٹر صاحبہ نے کہیں بھی معیار میں فرق نہیں آنے دیا اور اپنی سوچ کے بام کو بلند تر ہی رکھا اس راستے میں پست و بلند بھی حائل ہوئے لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے ہر کٹھن مقام کو سہل بنایا ۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کی غزلیات میں بے خودی، مسحوری کی ایک کیفیت ہے جو ہر مصرعے سے جھلکتی ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ کیفیات روایتی سہی لیکن ان میں کہنگی کے آثار محسوس نہیں ہوتے ہجر و وصال کا تذکرہ ہو جو عاشق کو بے خود کئے دیتا ہے یا محبوب کے حسین پیکر کا قصہ جو آبگینہ دل کو گداز کر جاتا ہے۔

بعد مدت کے ملی ہے خوبصورت رات تنہا
جاگنا ہو گا سحر تک آج اس کے ساتھ تنہا
کر گئی ہے بارہا ہم کو بھری محفل کے اندر

مختصر سی اک نظر ، چھوٹی سی کوئی بات تنہا(۴۴)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کی غزل میں ہمیں انائیت کا عنصر بھی ملتا ہے

چاند تاروں سے گئی رات کو دل کی باتیں

صبح کو ڈھونڈتے پھرتا وہی سپنوں والے(۴۵)

ڈاکٹر صاحبہ کی غزلیں معانی و تفہیم سے بھرپور نظر آتی ہیں لیکن اختصار ان کی معنویت کو کم نہیں کر سکا غمِ ذات سے غمِ کائنات تک ایک وسیع دنیا کو اپنی غزلوں اور نظموں میں جس طرح پیش کیا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے انہوں نے اپنی غزل کے کینوس کو بھی وسیع کیا ان کے ہاں انتظار، مایوسی کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں

''یونہی دھند میں کبھی دور تک مرے ساتھ چل کے تو دیکھتے

کبھی صبح تک شبِ ماہ میں میرے ساتھ تم بھی تو جاگتے

اسی انتظار میں کٹ گئے کئی روز و شب گئی عمر کے

کہ وہ ایک شے جسے مانگنیں آسکا اسے مانگتے!(۴۶)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بحیثیت شاعرہ رنگارنگ تجربوں کی ایک دنیا بسائی ہے ان کا کلام معیار اور مقدار کے حوالے سے ایک نئی فضا کا پتہ دیتا ہے ڈاکٹر صاحبہ نے ہر موضوع پر مختصر مگر جامع اندازِ فکر سے قلم اٹھایا اور کامیابی حاصل کی یہ ان کی محنت و لگن کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ آج اردو ادب میں اس مقام پر ہیں جس کی آرزو ہر لکھاری کرتا ہے۔

نجیبہ عارف بطورِ افسانہ نگار:

ڈاکٹر نجیبہ عارف عہد حاضر کی ممتاز تخلیق کار ہیں۔انہوں نے تخلیقی اظہار کے لیے اردو نثر میں افسانے، سفر نامہ، تحقیق و تنقید کے حوالے سے اصناف میں طبع آزمائی کی اس کے علاوہ شاعری کی ایک کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے اور ان سب کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام کی سند حاصل کی ہے۔ڈاکٹر نجیبہ کا قلم فنی اور فکری اعتبار سے

مسلسل ارتقاء پذیر رہا ہے اگر ہم ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تخلیقی اور تحقیقی سفر کا جائزہ لیں ان کی پہلی قابل ذکر تخلیق ان کے افسانے ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے تین افسانے منظر عام پر آئے ہیں:

۱۔ رائیگانی: یہ افسانہ سہ ماہی فنون لاہور میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ صدیوں بھرا لمحہ: یہ افسانہ ادبی رسالے سمبل جولائی ۲۰۰۹ء تا جون ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۳۔ سرحدِ امکان سے آگے: یہ افسانہ محمد عاصم بٹ کی ترتیب و انتخاب شدہ کتاب ۲۰۱۱ء کے بہترین افسانوں کا انتخاب میں شامل ہے۔

رائیگانی:

نجیبہ عارف نے اپنے افسانوں میں واحد متکلم کی تکنیک استعمال کی ہے۔ واحد متکلم جس کے پاس ایک عورت آتی ہے جو اسے اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں بتاتی ہے کہ اگرچہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر وہ نہیں بن پائی اس پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں گھر ہے بچے ہیں لیکن اس کے باوجود دوسروں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا چاہتی ہے اور وہ بتاتی ہے کہ اسے صرف عبادت میں سکون ملتا ہے اور واحد متکلم کو کہتی ہے کہ دنیا کو دل سے نکال دو لیکن اس پر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے وہ دنیا سے منہ نہیں موڑ سکتی ہے۔ اس افسانے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بتایا ہے۔

> ''زندگی کا ہر سانس ایک نئی زندگی ہے زندگی خود کو کبھی نہیں دہراتی تمہیں اپنی تطہیر کرنی ہے۔ اپنی روح کو دھو ڈالنا ہے پھر ایک لطافت میں ڈھل جائے گا تمہارا وجود۔ یہ سوچنا تمہارا کام نہیں وقت کا تعین خود نہیں کر سکتے۔ وقت کوئی اور متعین کرتا ہے تمہیں تو بس کوشش کرتے جانا ہے۔'' (۴۷)

نجیبہ عارف نے بتایا ہے کہ دل و دنیا میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے ذمہ داریوں، رشتوں، خواہشوں، لوگوں کو سکون بخشنے، ان کا خیال رکھنے، محبت کرنے میں، صرف یہی خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

صدیوں بھرا لمحہ:

نجیبہ عارف کا دوسرا افسانہ ''صدیوں بھرا لمحہ'' ہے یہ افسانہ چھ صفحات پر مشتمل ہے واحد متکلم کے ذریعے نجیبہ عارف نے بتایا ہے کہ انسان میں ابدی زندگی کی محبت، ابدیت کی تمنا، لازوال ہونے کی خواہش، ہمیشہ جیتے رہنے کی آرزو ہوتی ہے لیکن اسے یہ نہیں پتا ہوتا کہ اگلے لمحے یہ زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ اگلا لمحہ کبھی بھی آ سکتا ہے لیکن پھر بھی انسان یہی خواب دیکھتا ہے اُسے یہ اُمید رہتی ہے کہ شاید مرنے والے کی سانس دوبارہ بدن میں لوٹ آئے گی اور اسے پھر زندگی ملے گی۔

وہ لکھتی ہیں

''فرعونوں کی ممیوں کا بندوبست، چین، جاپان اور کوریا کے شاہی مقبروں میں مرنے والے کے ساتھ دفن کی جانے والی اشیائے ضرورت اور بعض اوقات غلاموں کی پلٹن، اور سزا، جزا کے تمام اِس امید پر قائم ہیں کہ مرنے والا پھر جلایا جائے گا۔'' (۴۸)

سرحدِ امکاں سے آگے:

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا تیسرا افسانہ ''سرحد امکاں سے آگے'' ہے یہ افسانہ سات صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر عاصم نے اسے ۲۰۱۱ء کے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے اس میں بھی واحد متکلم کے ذریعے بتایا ہے کہ ایک دوست نے واحد متکلم کو کہانی بھیجی لیکن وہ کسی غیر مانوس زبان میں تھی یعنی رنگوں اور لکیروں کی زبان میں کوشش اور محنت کے بعد واحد متکلم کو محسوس ہوتا ہے کہ کہانی تو دراصل ہے ہی نہیں اور کہانی اسے خود لکھنی ہے کافی محنت اور ریاضت کے بعد وہ کہانی تراش لیتی ہے وہ کہتی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی حد امکاں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اگرچہ یہ نہیں جانتے کہ حد امکاں کہاں ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

''زندگی بھر کی ریاضت کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے آخر کار اس معمے سے ایک کہانی تراش لی ایک انوکھی کہانی جسے اس سے پہلے نہ کسی نے پڑھا تھا پڑھنا تو ایک طرف اسے تو کسی نے لکھا بھی نہیں تھا۔ وہ تو امکانات کے ذخیرے کی صورت کمپیوٹر کی سکرین پر پڑی تھی۔ میں نے اسے تخلیق کیا تھا خود اپنی ریاضت اور فہم وادراک کی

بدولت''۔(۴۹)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے موضوعات ان کے گرد و پیش کی دنیا سے اخذ کیے گئے ہیں تاہم انہوں نے روحانی خیالات کو بھی پیش کیا ہے جہاں تک پیش کش کا تعلق ہے تو مصنفہ نے حقیقت پسندانہ سوچ سے کام لیا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے افسانوں کا اختتام کسی معین نقطے پر نہیں ہوتا بلکہ وہ قاری کو ایک سوچ دے کر کہانی ختم کر دیتی ہیں جس سے قاری خود نتائج اخذ کر لیتا ہے انہوں نے چھوٹے چھوٹے حقائق کو افسانوں میں پیش کیا ہے ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اس لیے ان کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتا انہوں نے عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے موضوعات کو اردو افسانے میں مہارت سے سمویا ہے ان کے اسلوب میں توانائی اور دلچسپی، گہرائی موجود ہے اس میں نہ بھاری پن ہے اور نہ سپاٹ پن ان کے پاس کہانی بنانے، اس کو نکھارنے اور مخصوص انداز میں آگے بڑھانے کی صلاحیت موجود ہے۔انہیں اظہارِ خیال پر عبور حاصل ہے وہ کم سے کم لفظوں میں واقعات کو سمیٹتی ہیں۔ وہ کہانی کو موضوع کے مطابق نیچرل اور موزوں اسلوب کا جامہ پہناتی ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں چھوٹے اور سادہ جملوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً

> ''آنکھیں بند کریں، گہری سانس لیں، اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیں، پیٹ کے، سینے کے، گردن کے، عضلات کو پھیلنے دیں، خود کو آرام دہ پوزیشن میں رکھیں، اور ان سب باتوں کا حاصل کیا؟ محض نیند؟؟ بے خوابی میرا مسئلہ نہیں ہے مجھے تو ایک نئی فہم کی تلاش ہے''۔(۵۰)

> ''کل اور آج میں کتنا فرق ہے، مگر دونوں کتنے ایک جیسے ہیں، کل اس کیتھڈرل میں کسی عام آدمی کا گزر آسان نہیں تھا یہ صرف بادشاہ، امرائے سلطنت اور خواص کی عبادت قبول کرتا تھا۔ آج یہاں کوئی بھی جا سکتا ہے وہ بھی جسے عبادت کرنی ہے اور وہ بھی جسے سیاحت کرنی ہے''۔(۵۱)

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے افسانوں میں جزئیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جزئیات نگاری افسانے کا اہم جزو ہے نجیبہ عارف نے اس جزو کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ایک لڑکی

کا سراپا ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

''سہ پہر کا وقت تھا اور میں گھر میں اکیلی تھی اچانک گھنٹی بجی میں نے سیڑھیاں اتر کر دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ناٹا قد چھوٹا سکرٹ پہن رکھا تھا اور سفید چھوٹی قمیض،سر پر سیاہ سکارف لپٹا ہوا تھا،چہرے پر بلا کی نرمی تھی،اس کے چہرے پر نرماہٹ،اور مہر و صحبت کی تابانی تھی۔''(۵۲)

اِسی طرح وہ لکھتی ہیں

''اس وسیع وعریض چوک میں گھوڑوں پر بیٹھ کر،چست لباس میں ملبوس سپاہی گشت کرتے تھے،ہاتھ میں ٹھوٹھے تھام کر تپسوی،اپنی خانقاہ سے نکل کر سیڑھیاں اترتے اور شہر والوں سے خیرات لینے جاتے تھے انہیں اس شہر کی رونقیں کیسی لگتی ہوں گی گلیوں سے گزرتی ناریوں کے سفید ہاتھ اور بادامی آنکھیں انہیں کچھ نہ کہتی تھیں گھروں کی کھڑکیوں سے لٹکے پھولوں بھرے گملے اور پردوں سے چھن چھن کر آتی بچوں کی ہنسی اورگرم سوپ کی خوشبو،انہیں لوٹ کر اپنی تاریک کوٹھڑی میں جانے سے روکتی نہیں تھی۔''(۵۳)

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے افسانوں کے اسلوب میں رنگینی اور شادابی ہے وہ افسانے میں فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا پورا خیال رکھتی ہیں۔نجیبہ عارف کے افسانوں میں اسرار بھی ہے،سحر بھی اور شعریت بھی انہوں نے ان سب کو افسانوں میں اپنایا ہے۔

''زندگی سے آدمی کی محبت........

اوہ یہ محبت کتنی نا قابلِ انکار ہے،

اس کی مزاحمت نہیں کی جاسکتی

اس کو دل سے نہیں نکالا جاسکتا

جو لوگ کسی اور کی محبت کے نام پر مر جاتے ہیں اِنہیں بھی دراصل

زندگی کی محبت ہی مرنے پر مجبور کرتی ہے‘‘(۵۴)

’’عارف کا دل

یہ دل سبز مخملی گھاس کے حد نظر تک پھیلے ہوئے میدان کے مشابہ ہے

اس مخمل پر لیٹ کر آسمان کے نیلے پانی میں ڈوبا جا سکتا ہے،

اندر کے کالے پانی میں اترا جا سکتا ہے،

اِس میدان کے خودرو پھول رنگین بھی ہیں اور خوشبودار بھی، انہیں توڑنا منع ہے

ایسی جگہ کہیں اور نہیں ہے ایسی کشادگی کا احساس کہیں اور نہیں ہے

یہ کشادگی کا احساس محبت ہے یا خوشی؟

دور اس بنچ پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو یہ احساس میسر ہے؟

ایک دوسرے سے جڑے ہوئے جسموں کے مابین اس کشادگی کا تیقن ہوا کی طرح بہہ

رہا ہے؟

یا محض ایک خلا ہے؟

کون جانے، کیا ہے؟(۵۵)

واحد متکلم کے ذریعے کہانی کہنا افسانے کا نمایاں رجحان ہے افسانے میں واحد غائب اور واحد متکلم کے ذریعے مکالمہ، عمل، گفتگو اور کردار کی سوچ وغیرہ کے ردوبدل سے کردار نگاری کی مختلف صورتیں سامنے آتی ہیں، ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنے افسانوں میں واحد متکلم کی تکنیک کا استعمال کیا ہے واحد متکلم کردار مصنف کی افسانے میں براہِ راست شرکت کی بناء پر کئی لحاظ سے اہم اور بامعنی ہو جاتا ہے افسانے کے موضوع اور کرداروں کے حالات کے پیشِ نظر ان کی پیش کش کے طریقے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان واحد متکلم کی مختلف صورتوں کے بارے میں لکھتی ہیں

’’کبھی واحد متکلم خود اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے اِسی طرح اپنے خیالات

وجذبات کا اظہار کرتا ہے یہ خود کلامی کی تکنیک کہلاتی ہے اس سے ملتی جلتی ایک اور تکنیک ہے جس میں ایک ہی شخص مخاطب ہوتا ہے اور بولنے والا صیغہ متکلم میں بولتا ہے لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ مخاطب کون ہے''(۵۶)

نجیبہ عارف نے واحد متکلم کو اپنے افسانوں میں خوبی سے برتا ہے ان کے افسانوں میں کردار نہیں ہے بلکہ وہ واحد متکلم کے ذریعے کہانی بیان کرتی ہیں ان کے افسانوں میں مواد، موضوع، پلاٹ، منظر نگاری اور دلکش اسلوب کا استعمال کئی اعتبار سے منفرد نظر آتا ہے ان کے جملے سادہ مگر معنویت سے بھرپور ہیں یہی ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف مکالمے کو عبارت میں ملا دیتی ہیں جس سے کئی مقامات پر کردار، خیالات اور مکالمے میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا واحد متکلم انسانی اور وجودی مسائل کے حوالے سے سامنے آتا ہے انہوں نے مکالمہ نگاری کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور خود کلامی کو بھی۔ مکالمہ نگاری بھی افسانے کا اہم جزو ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر

تمہاری زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے کیا اس سال کے دوران تمھاری زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

میں نے سوچ کر کہا ہاں میں نے نئی جاب جوائن کی ہے

وہ خوش ہو گئی

ٹھیک اب ایک اور دور شروع ہونے والا ہے تم تیار ہو جاؤ

ایک اور دور.....اندر کے باہر؟؟؟

اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا اور بولی

تمہارے کئی امتحان لیے گئے ہیں تمہارے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں تم بار بار دنیا کی طرف پلٹ آتی ہو

مگر میری ذمہ داریاں میرے فرائض........

اب تو تمہارے سر پر چھت ہے پیٹ بھرنے کو روٹی میسر ہے

لیکن میرے بچے، میرا گھر میرا باس میری نوکری

تم پریشان بہت جلدی ہو جاتی ہو(۵۷)

ہاں باہر کی تبدیلی کیا ہو سکتی تھی بھلا کیا ہو سکتی ہے یہ تبدیلی

پروموشن، گریڈ، انعامی بانڈ، امیگریشن؟

ایسے ہی کتنے امکانات میرے خیال میں بار بار کوند جانے لگے

میں نے بے دھیانی میں کھڑکی کا پردہ ہٹایا(۵۸)

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں ہمیں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کے لیے قارئین افسانوں کو پڑھتے ہیں اگرچہ انہوں نے تین افسانے لکھے ہیں لیکن انہیں افسانہ نگاری کے اجزا سے واقفیت ہے وہ ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آسکتی ہیں۔ان کے اسلوب میں دلکشی ہے ان کے موضوعات میں انفرادیت ہے انہوں نے افسانہ نگاری کی طرف کم توجہ دی ہے لیکن وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ثابت ہوں گی منصفہ کے نزدیک قاری تک خیال کی ترسیل ضروری ہے اس لیے وہ بات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل الدین عالی (اداریہ) شش ماہی غالب، کراچی، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۶۔

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۳۵۳

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو نثر کے آفاق، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۶۹

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۲

۵۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلیشر حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنو، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸

۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، جلد ۳۶، ص ۱۵۳

۷۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال (یورپ کا سفر نامہ) ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۹۔

۸۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۱۱۹۔

۹۔ ایضاً ص ۱۶۰

۱۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال (یورپ کا سفر نامہ) ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۱۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۱۷۱۔۱۷۲

۱۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال (یورپ کا سفر نامہ) ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۴۔۱۹۵

۱۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۱۷۵

۱۴۔ صدف فاطمہ، ڈاکٹر، خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ص ۶۴

۱۵۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۱۵۳۔۱۵۴

۱۶۔ ایضاً ص ۱۷۲

۱۷۔ ایضاً ص ۱۷۷

۱۸۔ ایضاً ص ۱۱۴

۱۹۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۱۸۵

۲۰۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال (یورپ کا سفر نامہ) ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۴

۲۱۔ ایضاً ص ۱۸۷

۲۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، آرے رانگ، (جنوبی کوریا کا سفر نامہ)، ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، جلد ۳۷، ص ۶۷

۲۳۔ جیبہ عارف، ڈاکٹر، جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال (یورپ کا سفر نامہ) ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۵

۲۴۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، معانی سے زیادہ، شہرزاد کراچی، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۸۶

۲۵۔ ایضاً ص ۱۰۱

۲۶۔ ایضاً ص ۹۰

۲۷۔ ایضاً ص ۱۲۵

۲۸۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص ۴۳

۲۹۔ ایضاً ص ۵۳

۳۰۔ ایضاً ص ۵۴

۳۱۔ ایضاً ص ۱۲۸

۳۲۔ ایضاً ص ۱۱۵

۳۳۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص ۱۱۶

۳۴۔ ایضاً ص۳۱

۳۵۔ ایضاً ص۳۹

۳۶۔ ایضاً ص۱۳۰

۳۷۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص ۱۹

۳۸۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص ۲۱

۳۹۔ ایضاً ص۱۶

۴۰۔ ایضاً ص۱۵۴

۴۱۔ ایضاً ص۱۵۷

۴۲۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص ۱۴۵

۴۳۔ ایضاً ص۵۷

۴۴۔ ایضاً ص۶۴

۴۵۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص۱۵۳

۴۶۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،معانی سے زیادہ،شہرزادکراچی، جولائی ۲۰۱۵ء،ص۱۴۴

۴۷۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،رائیگانی (افسانہ) سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ نمبر۱۳۰، اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۰ء،ص۲۰۶

۴۸۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، صدیوں بھرا لمحہ (افسانہ) سہ ماہی سمبل، راولپنڈی، سال نامہ شمارہ ۱ تا ۴، جولائی

۲۰۰۹ءتا جون۲۰۱۰ءصفحہ۵۲۵

۴۹۔ نجیبہ عارف، ۲۰۱۱ء کے بہترین افسانوں کا انتخاب، ترتیب و انتخاب محمد عاصم بٹ، تخلیقات، لاہور، صفحہ۳۷۹

۵۰۔ ایضاً صفحہ۷۷

۵۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، صدیوں بھرا لمحہ (افسانہ) سہ ماہی سمبل، راولپنڈی، سال نامہ شمارہ ۱ تا ۴، جولائی ۲۰۰۹ءتا جون۲۰۱۰ءصفحہ۵۲۴

۵۲۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رائیگانی (افسانہ) سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ نمبر۱۳۰، اکتوبر تا دسمبر۲۰۱۰، ص۲۰۳

۵۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، صدیوں بھرا لمحہ (افسانہ) سہ ماہی سمبل، راولپنڈی، سال نامہ شمارہ ۱ تا ۴، جولائی ۲۰۰۹ءتا جون۲۰۱۰ءصفحہ۵۲۳

۵۴۔ ایضاً صفحہ۵۲۵

۵۵۔ ایضاً صفحہ۵۲۶

۵۶۔ نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیکیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۴ء، صفحہ۳۴

۵۷۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، رائیگانی (افسانہ) سہ ماہی فنون، لاہور، شمارہ نمبر ۱۳۰، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۰، ص۲۰۷ تا ۲۰۸

۵۸۔ ایضاً صفحہ۲۰۸

باب ششم

مجموعی جائزہ

ڈاکٹر نجیبہ عارف خواتین اہل قلم میں بلاشبہ ایک حوالہ ہیں انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لئے کئی اصناف میں بیک وقت طبع آزمائی کی جس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ بڑے ذہن کو کسی ایک صنف میں مقید نہیں کیا جا سکتا وہ اپنی تشفی کے لئے کبھی نثر کی راہ اپناتا ہے کبھی شعر کی اور کبھی تحقیقی و تنقیدی انداز میں ادب کی دنیا کی کھوج لگانے لگتا ہے۔انھوں نے چونکہ بطور محقق و نقاد اردو ادب میں اپنے لیے راہیں ہموار کیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئیں۔ تحقیق سے مراد تلاش حقیقت، انکشاف حقیقت اور نا معلوم کی جستجو کرنا کے ہیں تحقیق صداقت کی تلاش کا عمل ہے جس کے لئے محققانہ مزاج کی ضرورت ہوتی ہے تحقیق کے مقاصد میں نظریے کی نشو و نما اور حقائق کی چھان بین شامل ہیں اردو میں تحقیق کی روایت قدیم تو ہے لیکن اس میں وسعت اور سنجیدگی ضرور پائی جاتی ہے اردو ادب میں تحقیق کا آغاز تذکروں سے ہوا۔تذکروں کے علاوہ لغات میں بھی محققانہ شعور کی تگ و دو نظر آتی ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تخلیقی و تنقیدی جہات میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی علمی و ادبی تمام جہتوں کا احاطہ کیا جائے اور کوئی پہلو صرف نظر نہ ہونے پائے ان کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ تحقیقی و علمی شان کو بھی بغیر کسی مبالغے کے حقیقی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نجیبہ عارف کا تنقیدی اور تحقیقی سفر کس طرح شروع ہوا ان کا ماحول ان کے ادبی نظریات کی نشو نما میں کیسے معاون ثابت ہوا یہ ابتدائی ابواب میں بیان کیا گیا ہے دراصل نجیبہ عارف کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہی انہیں تحقیق و تنقید کی طرف لے کر آیا اور تحقیق بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔وہ ایک ایسے خاندان کی فرد ہے جو علمیت میں بھی بے مثال ہے۔یہی وجہ ہے کے ڈاکٹر صاحبہ کی بنیادی ادبی تربیت میں ان کا ماحول شامل رہا ہے بچپن ہی سے ادبی ذوق و شوق کی بدولت ڈاکٹر صاحبہ نے علم کی منازل بڑی کامیابی اور تیزی سے طے کیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے صحافت کے میدان میں بھی خاطر خواہ قدم جمائے۔اگر دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے بعد بلکہ اس بھی پہلے برصغیر کی مسلمان خواتین نے علم و ادب کے ہر شعبے میں اپنے لئے ایک الگ مقام بنایا اور اپنے علم

وادبی تشخص کو اجاگر کیا یہی نہیں بلکہ ادب صحافت اور شاعری میں خواتین کا کردار ہر چند کہ تاریخوں میں شایانِ شان طور پر محفوظ نہیں کیا تاہم ان کی خدمات کا اعتراف کسی نہ کسی طور پر ضرور نظر آتا ہے۔ شاعری اور افسانے سے قطع نظر صحافت میں خواتین کی خدمات بھی تاریخ علم وادب کا ایک الگ باب ہے جس پر تا حال توجہ نہیں کی گئی۔ نجیبہ عارف انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کے رسالے ''معیار'' اور لمز یونیورسٹی لاہور کے رسالے ''بنیاد'' کی مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو مجلّات کے اشاریہ سازی کے لئے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پہلا مرکز اشاریہ سازی بھی قائم کیا۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف منفرد اسلوب رکھنے والی انفرادیت پسند ادیب بھی ہیں اور بے مثال زبان دان اور ہمہ جہت محقق بھی، ان کی بنیادی حیثیت ایک محقق کی ہے انہوں نے تنقید وتحقیق کے میدان میں نئی جہتوں کا سراغ لگایا ہے پاکستان میں تحقیقی کاوشوں کے دوران جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا سامنا ڈاکٹر صاحبہ کو بھی کرنا پڑا لیکن ان کی مختلف علمی وادبی حیثیات نے ان کی رہنمائی کی وہ بیک وقت استاد، محقق، شاعرہ، ماہرِ تعلیم اور علم وادب کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بلند پایہ محقق ہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے منفرد انداز کو برقرار رکھتے ہوئے ممتاز مفتی کی شخصیت اور فن کا تجزیہ حقیقت پسندی کے ساتھ کیا۔ میں نے اپنے اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق کے پیچھے چھپے حقائق تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں انہوں نے اپنی تحقیق کے طریقہء کار کی بنیاد بنایا مثلاً مستند حوالہ جات، درست ترین نسخے کا انتخاب اور سن اشاعت وغیرہ کا تعین۔ ڈاکٹر صاحبہ نے محقق بن کران کا تاریخی پسِ منظر بتایا ہے۔ ان کے اندر کا نقاد محض ایک زاویے سے کسی ادیب کے فکر وفن کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ ان کی نگاہ موضوع کے ہر پہلو کی طرف جاتی ہے ان کا فلسفیانہ انداز ان کی تحقیق کو متوازن رُخ عطا کر کے ایک مُنفرد تحریر بنا دیتا ہے اس سے ان کی تحریر میں اثر انگیزی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے گویا تحقیق وتنقید کو اپنے لیے چنا تحقیق فنی اور علمی اعتبار سے مشکل اور محنت طلب کام ہے جس میں عموماً مرد حضرات کے کام اس لیے نمایاں ہوئے کہ تحقیقی ذرائع کی فراہمی اور مواد کے حصول کے لیے جتنی تگ ودو مردوں کے لیے ممکن تھی گھر کی چار دیواری سے وابستہ عورتوں کے لیے اس کے امکانات زیادہ روشن

نہیں تھے اس کے باوجود دیکھا گیا کہ خواتین نے جہاں اعلیٰ سطح کی تدریس میں بحیثیتِ استاد نام پیدا کیا وہاں علمی مراکز کی ضرورتوں کے مطابق تحقیقی خدمات بھی انجام دیں اور تاریخِ ادب کو مفید اور اہم موضوعات عطا کیے اور خامیوں کو دُور کیا۔ تحقیق کے کام میں دو امور بڑی اہمیت رکھتے ہیں ایک تو قلمی مخطوطات کی تلاش، نادر کُتب کی فراہمی اور نایاب مواد کیے لیے کوشش کرنا اور دوسرا ان پر کام کرنا انفرادی اور امتیازی کاوش بن جاتا ہے اور فراہم شُدہ مواد سے صحیح نتائج اخذ کرنا، دستیاب شدہ مواد کو اس طرح ترتیب دینا کہ مناسب اور واضح نتائج سامنے آسکیں اور ڈاکٹر صاحبہ نے ان تمام امور کو ملحوظِ خاطر رکھا انہوں نے باریک بینی سے ان قلمی کُتب کا مطالعہ کیا روز وشب کی محنت سے مواد اکٹھا کیا اور اپنے اخذ شُدہ نتائج کو مدون کیا ڈاکٹر صاحبہ ایک محقق خاتون ہیں جن کی علمی وادبی کارناموں میں صبر واستقامت نمایاں ہے انہوں نے ادب کے حوالے سے جو مواد اکٹھا کیا اس مواد کو نہایت نفاست اور ترتیب سے بیان کیا۔

ان کے اندازِ تحقیق کی ایک اور نمایاں خوبی جو انہیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے وہ اندازِ تحریر ہے ان کا اندازِ تحریر سلیس، شگفتہ اور رواں دواں ہے وہ سادہ انداز میں لکھتی ہیں دقیق الفاظ سے گریز کرتی ہیں وہ سلیس زبان میں لکھتی چلی جاتی ہیں اور جن لوگوں کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا اور جن کے احساسات میں کوئی تناؤ نہیں ہوتا وہ عام فہم زبان میں لکھتے چلے جاتے ہیں ان کے ہاں مشکل تراکیب نہیں ملتی نہ ہی مشکل الفاظ ملتے ہیں بلکہ ان کی تحریر فصاحت سے آراستہ ہوتی ہے جن ادیبوں کی تحریروں میں دلکشی اور دلچسپی ہوتی ہے وہ صحیح خیال کی صحیح ترجمانی کے لیے صحیح لفظ استعمال کرتے ہیں یہی کیفیت ڈاکٹر نجیبہ عارف کی ہے انہوں نے کبھی تصنع وبناوٹ سے کام نہیں لیا موقع محل کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کیا اور اسی مناسبت سے اندازِ تحریر اختیار کیا ان کا اسلوبِ نگارش ان کی زندگی کا پیرہن ہے اس کی صورت ان کی تحریر میں جھلکتی ہے اور اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی تحقیق کی بنیاد اس اصول پر رکھی کہ داخلی خارجی دونوں شہادتوں کو سامنے رکھ کر مسلمہ حقائق کے ساتھ نتائج فکر کو پیش کیا جائے اس مقالے میں ڈاکٹر صاحبہ کو ایک محقق کے طور پر الگ جب کہ ایک نقاد کی حیثیت سے الگ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ انہوں نے ان دونوں شعبوں کے مابین فرق وامتیاز روا نہیں رکھا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کو نفسیاتی نقاد بھی کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ نفسیات ان کے

اندازِ تنقید کا محض ایک پہلو ہے وہ حقائق کو سماجی وتہذیبی ،تاریخی معاشی اور تمام پہلوؤں سے دیکھتی ہیں۔اس طرح جب ان کے نظامِ تنقید میں تاریخ ،تحقیق ،نفسیات ،عمرانیات اور تنقید یکجا ہو جائے تو ان کی تنقید بذاتِ خود ایک فن پارہ بن جاتی ہے اردو ادب کی اصناف مقالے،مضامین،شاعری اور تحقیق یہ سب موضوعات ڈاکٹر صاحبہ کی تنقید اور تحقیق کا حصہ ہیں انہوں نے اردو تحقیق وتنقید میں جرأت پسندی کی بنیاد رکھی اور اکثر شعراء کے کلام کا جائزہ ان کے ذاتی حالات کے تناظر میں لیتی ہیں انہوں نے تحقیق کے دوران اقعات کی صحت، چھان بین،اور ترتیب وتدوین کے تقاضوں کو بڑی عرقِ ریزی سے نبھایا ہے۔

میں نے اس مقالے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی علمی وتحقیقی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اہم اور دلچسپ ہیں اور انہیں مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے ڈاکٹر صاحبہ کی ابتدائی زندگی کے ابتدائی واقعات تعلیم وتربیت اور ماحول نے ان کی نفسیات پر کیا اثرات مرتب کیے اور ان کا علمی ماحول کس طرح اردو ادب کے حوالے سے ان پر اثر انداز ہوا یہ کہانی ربع صدی کے مطالعے کی رہینِ منت ہے ڈاکٹر صاحبہ نے بطورِ مدارس، بطورِ محقق، نقاد، افسانہ نگار، شاعرہ، مترجم ،سفر نامہ نگار، مدیر اردو ادب کو کیا دیا ہے ان امور کا تذکرہ میرے مقالے کے مختلف ابواب میں موجود ہے ڈاکٹر صاحبہ کی تنقید وتحقیق کسی خاص خانے تک محدود نہیں بلکہ وہ کسی بھی عہد اور ماحول کا تاریخی وسماجی مطالعہ کرنے کے بعد نفسیاتی تجزیہ بھی کرتی ہیں وہ کسی ادیب کے ہاں رنگوں تاریکی اور روشنی کے تاثر کی وضاحت پیش کرتی ہیں اور وہ خود بھی ان حسیات کا ادراک رکھتی ہیں۔ان کی تحقیق میں شُبے اور انکار کی طرز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ حقائق کو من وعن قبول نہیں کرتیں بلکہ سماجی ،عصری صورتِ حال اور شہادتوں کی مدد حاصل کر کے سچائی کے معیار پر لاتی ہیں مثال کے طور پر ممتاز مفتی کی روحانیت کے بارے میں بھی انہوں نے حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی کب وہ روحانیت کی طرف مائل ہوئے ورنہ عام شہادتیں مذکورہ حقائق کی تصدیق نہیں کرتیں۔

بطور سفر نامہ نگار بھی ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اردو ادب میں پہچان بنائی ان کے دو سفر نامے مختلف رسالوں میں چھپتے رہے ان سفر ناموں کو پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ اردو ادب کا ایک جیتا جاگتا شاہکار ہیں جو کہ ہر فن اپنے اندر سمو لینے کی طاقت رکھتا ہے۔انھوں نے بیرونی ممالک کے سفر بھی کیے اور ان کے سفر نامے ایک عورت

کی آنکھ سے دیکھی دُنیا کا اظہار نہیں بلکہ ایک فرد کے ذہن کی جستجو کا سفر ہے جو کبھی لائبریریوں میں بھٹکتا ہے اور کبھی یونیورسٹیوں میں، ان سفرناموں میں سفرنامہ نگار کی پیاس اور جستجو قابلِ ذکر اور قابلِ تقلید ہے کیونکہ انسانی فطرت میں سفر پسندی کی ایک وجہ اس کا تنوع پسند ہے وہ جس جگہ کو مسکن بناتا ہے اور جس فضا میں سانس لیتا ہے کچھ ہی عرصے بعد اس کی یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے اور پھر کسی دوسری جگہ پر عارضی قیام اسے نہ صرف تفریحِ طبع پہنچاتا ہے بلکہ اس سے گزشتہ ایام کی طویل یکسانیت اور بوریت بھی ختم ہوجاتی ہے اور انسان سفر سے واپسی پر جب سفر کے حالات بیان کرتا ہے تو ایک بار پھر تازہ دم ہوجاتا ہے اور انسانی سفر کے دوران میں مسافر جن جن مراحل سے گزرتا ہے انہیں صیغۂ راز میں رکھنے کی بجائے اسی طرح ایک داستان میں بیان کردیتا ہے اور پڑھنے والے کو لگتا ہے کہ وہ بھی سفرنامہ نگار کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کے سفرناموں میں بھی ایک ایسا فطری تجسس موجود ہے جو خارجی مناظر کو داخلی حسن کے معیار پر پرکھتا ہے اور پھر اسے دادِ تحسین سے نوازتا ہے وہ حقیقت کو شعوری طور پر بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرناموں میں حقائق اور خیالات ایک ساتھ نظر آتے ہیں انہوں نے ہر مقام اور منزل پر حقائق و مناظر کا جائزہ لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سفر وسیلہ ظفر ہے تو یہ بات ہر کسی کے حق میں سچ نہیں ہو پاتی نہ ہی ظفر یابی ہمیشہ کسی ٹھوس شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے یہ صرف اُن لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو ظاہری سفر میں بھی اندرونی سفر کے بہانے تلاش کرتے ہیں خوش قسمتی سے نجیبہ عارف کو وہ باطن ودیعت حاصل ہے جسے سفر کی تڑپ اور اضطراب سے نکالنے کا ہنر آتا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف نے افسانے بھی لکھے جو میرے مقالے کا حصہ بھی ہیں ان میں انہوں نے زندگی کی بات کی ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی کہانیاں ذات، زندگی کے گرد گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ بڑا افسانہ اور بڑے کردار تخلیق کرنے کی پوری قدرت رکھتی ہیں زبان و بیاں پر بھی ان کو قدرت حاصل ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک مترجم کی حیثیت سے بھی سامنے آئی ہیں ترجمہ نگاری میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ عکسی مفتی کی انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ تلاش اللہ ماورا کا تعین کے نام سے کیا ہے اور اس خوبصورتی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے کہ ان کی کتاب ترجمہ کی ہوئی نہیں لگتی ایسا لگتا ہے کہ ان کی اپنی تصنیف ہے ترجمہ کرتے ہوئے انہوں اسلوب بھی وہی اپنایا ہے جو انگریزی کتاب کے حوالے سے مناسب تھا ڈاکٹر صاحبہ کو زبان و بیاں پر عبور حاصل ہے ان کے جملوں کی ساخت اور فقروں کی ترتیب خوب صورت اور جملہ مواد کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتا ہے

ان کے اسلوب میں روانی ان کے گہرے تجربے کا آئینہ دار ہے۔انھوں نے اپنے احساسات کوشاعری کے انداز میں بیان کیا ہے ان کا شاعرانہ مجموعہ ان کے قلب روح پر گزری وارداتوں کے منظوم کا بیان ہے وہ اپنی ذات میں گُم ہوکر شعر کہتی ہیں ان کا اندازِ بیاں سادہ مگر رواں ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتی ہیں جہاں فرد اور قوم کو بے اطمینانی نہ ہوسب کوحقوق حاصل ہوں وہ معاشرتی ناہمواریوں اورطبقاتی امتیازات کو برداشت نہیں کر پاتیں انہوں نے عصری صورتِ حال کے سیاسی، سماجی پہلوؤں کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا۔انہوں نے اپنی نظموں میں بے شمار تجربات کیے ہیں ان موضوعات میں تصنع سے بیزاری، اور انصاف کی قدروں سے فطری لگاؤ پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری جدید نظم میں عصری مسائل کا تخلیقی اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے چند بڑے سوالوں کا جواب بھی تلاش کرتی نظر آتی ہیں مثلاً انسان، موت، فنا، تلاشِ ذات اور حقیقت وعرفان وغیرہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی انہی خصوصیات کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ وہ عہدِ حاضر کی ایک باکمال شاعرہ ہیں جن کے ہاں ہر طرح کی شعریت موجود ہے اور وہ تمام شعری تقاضوں کو نبھاتی ہوئی نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کام ،محنت اور لگن کی وجہ سے آج اس مقام پر ہیں جس کی صحیح معنوں میں وہ حقدار ہیں ان کی شاعری انسان دوستی کی ترجمان ہے اور اس میں طبقاتی ناہمواریوں کا بیان خوب صورت انداز میں ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف کی شاعری دراصل ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھی جس میں زندگی کے تمام کرب ومسائل اور نشیب وفراز بھی موجود تھے ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی شاعری جہاں رومانیت کے مضامین بیان کیے ہیں وہاں آپ نے عام لوگوں کے مسائل کی بھی بات کی ہے ان کی نظر میں معاشرے کا کوئی بھی فرد اگر مجبور ولاچار ہے تو یہ پورے معاشرے کی ناکامی ہے ان کے ہاں انسانیت ہی سب سے اہم مذہب ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں عصر حاضر میں ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار، مترجم، مدیر، محقق ونقاد کے طور پر سامنے آئی ہیں اور معاصر اردو فکشن کے میدان میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ وہ تنوع اور بلند پرداری کی خصوصیات کی قائل ہیں تو یہ اوصاف ان کے اپنے کلام میں بھی ملیں گے ان کی تنقید وتحقیق میں وہ عناصر نمایاں ہیں جو وہ دیگر لکھنے والوں میں دیکھنا چاہتی ہیں اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے فکروفن کی وسعت کو سمیٹا جائے اور ان کے کام کی ہر جہت کو نمایاں کیا جا سکے مجھے یقین ہے کہ یہ مقالہ آنے والی

نسلوں میں تحقیق کے شوق کو ابھارنے کے لیے مہمیز کا کام دے گا علاوہ ازیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق و تالیف اور فکر و کلام کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرے گا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی ادبی خدمات اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواتین کی تحقیق و تنقید پر جب بھی کوئی سنجیدہ کام کیا جائے گا تو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی تحقیق و تنقیدی کاوشوں کو یقیناً ان میں نمایاں جگہ حاصل ہو گی۔

نتائج:

ڈاکٹر نجیبہ عارف اردو ادب کا ایسا نام ہے جنھوں نے اپنی تحقیقی و تنقیدی جہات کی بدولت بہت کم عرصے میں منفرد مقام حاصل کیا ہے انھوں نے جو تحقیق و تنقید کی ہے وہ ان کے قوت مشاہدہ اور وسیع مطالعے کی دلیل ہے ان کا انداز وضاحتی ہے۔ وہ تحقیق کے دوران واقعات کی صحت چھان بین اور ترتیب و فکر کے تقاضوں کو بڑی عرق ریزی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کرتی ہیں ان کی نگاہ موضوع کے ہر پہلو کی طرف جاتی ہے۔ اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بات کی تہہ میں جا کر پوری وضاحت کے ساتھ اپنی بات بیان کریں۔ اچھے نقاد کی یہی خوبی ہے کہ وہ تخلیقی فن پاروں کی معنوی جہات کی نشاندہی کرے اور ان میں چھپے ہوئے معنیات کی موجودگی (یا عدم موجودگی) کی تجزیاتی مطالعے سے فن پارے کے متن میں چھپے ہوئے خوبصورت اور اس کے اسرار و رموز کو جس حد تک بھی ممکن ہو سکے سامنے لائے نجیبہ عارف کے ہاں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ ان کے واضح خیالات ہیں وہ جو محسوس کرتی ہیں اور جس نتیجے پر پہنچتی ہیں اسے قاری تک منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت تخلیقی ادیب ان کے موضوعات میں تنوع ہے زبان رواں دواں اور اسلوب سادہ جاذبیت رکھتا ہے ان کے مقالات کا مجموعہ ایک بڑے عہد کا احاطہ کرتے ہوئے قاری کو پرانے اور نئے لکھنے والوں کے کام سے آشنا کراتا ہے ادب کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر صاف ہے اور نئی ادبی روایت کو جانچتے ہوئے نثر و شعر کو بھی ذہن میں رکھتی ہیں جس سے ان کی تحریر میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

۱۔ نجیبہ عارف کا تحقیقی و تنقیدی طریقہ کار عملی ہے وہ تاثراتی تنقید پر یقین نہیں رکھتیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقید میں سائنٹیفک انداز اختیار کیا اور اپنی تحریروں کو زیادہ موثر اور جامع انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

۲۔ نجیبہ عارف کی ادبی شخصیت ان کے مزاج اور عادات کی آئینہ دار ہے ان کی شاعری میں ان کی

ذات،معاشرتی مسائل،معاصرزندگی کے ساتھ ساتھ انسانی احساسات وجذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔خاص طور پران کی غزلیں ایک منفرد لب ولہجہ رکھتی ہیں جبکہ ان کی نثری نظمیں جدید اردونظم کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔ان کے موضوعات حسن وعشق کی کیفیات،وصل وفراق کی داستانیں،ماضی کی یادیں اپنے تمام ترفنی محاسن کے ساتھ موجود ہیں۔اس کے علاوہ وہ نثر میں بھی اپنے خاص انداز سے جلوہ گر ہوئی ہیں ان کے افسانے اورسفرنامے ان کی سادہ پراثر نثر کے حامل ہیں خاص طور پران کے سفرنامے میں قاری ہرمقام پران کے ساتھ ساتھ رہتا ہے وہ جودیکھتی ہیں محسوس کرتی ہیں قاری بھی اسی تجربے سے ان کے ساتھ گزرتا ہے کئی مقامات پرتو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید قاری اسی مقام پر ہے جہاں کا احوال سفرنامے میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ نجیبہ عارف جدید معاصرادبی منظرنامے میں ایک محقق،نقاداورادیبہ کے طور پرابھرکرسامنے آئی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ آنے والے دور میں ان کا شمار اہم محققین اورناقدین میں ہوگا۔

تجاویزاورسفارشات

ڈاکٹرنجیبہ عارف کا شماردورحاضر میں اہم لکھنے والوں ہوتا ہے اوراردوادب میں محقق اورنقادکی حیثیت سے جانی جاتی ہیں ان کے افسانے،سفرنامے،شاعری گویاہمارے معاشرے کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی زبان رواں اورسادہ ہے اوراسلوب سادہ جاذبیت رکھتا ہے انھوں نے اپنے مقصداورفن کے توازن کوسمجھتا ہے۔اس مقالے میں ڈاکٹرنجیبہ عارف کی غیرمدون معلومات کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں اوران کی تحقیق،تنقیداورشاعری سے متعلق ایسے گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جوعام قاری کی نظر سے اوجھل ہیں مثال کے طور پران کے سفرنامے،اورافسانے اس ضمن میں خاص طور پرقابل ذکر ہیں۔

زیرنظرمقالہ لکھنے کے دوران مجھے موضوع مقالہ کی شخصیت کوتفصیل سے جاننے کا موقع ملااس سلسلے میں میری طرف سے چندتجاویزاورسفارشات پیش خدمت ہیں۔

ا۔ ڈاکٹرنجیبہ عارف کی کاوشوں (تحقیقی وتنقیدی) کونمایاں کرنے کے لیے اس موضوع پرایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی سطح کے مقالات لکھوائے جائیں۔

۲۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کو بحیثیت ماہر تعلیم متعارف کرایا جائے۔ تجویز کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کے اس پہلو پر ایک اچھا علمی کام سامنے لایا جائے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحبہ کا ناول بھی زیر طبع ہے اس کے علاوہ ان کی اور کتب بھی زیر اشاعت ہیں آئندہ لکھے جانے والے مقالہ جات کو بھی زیر بحث لایا جائے۔

۴۔ میں نے ان کی افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری، سفر نگاری، شاعری تحقیق و تنقید پر مجموعی طور پر کام کیا ہے۔ تحقیق و تنقید پر انفرادی مطالعہ کر کے الگ الگ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

بکل دے وچ چور (متصوفانہ افسانے) الفیصل ناشران، لاہور،۲۰۱۲ء

تلاش اللہ ماورا کا تعین (ترجمہ) عکسی مفتی، الفیصل ناشران، لاہور،۲۰۱۲ء

رفتہ و آئندہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

معانی سے زیادہ، شہزاد، کراچی، ۲۰۱۵ء

ممتاز مفتی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء، الفیصل ناشران، لاہور،۲۰۱۲ء

۹۱۱ اور اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

ثانوی ماخذ

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، عمر کتاب گھر، کراچی،۱۹۸۲ء

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنو کا دبستان شاعری، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷ء

احتشام حسین صدیقی، تنقیدی نظریات، لاہور اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء

افتخار احمد صدیقی، اردو کے ادبی مسائل، مضمون، مشمولہ، اردو صحافت، مرتبہ، انور علی دہلوی بک ٹاک لاہور، ۱۹۹۱ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ اردو، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۱ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو نثر کے آفاق، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء

امداد امام اختر، کاشف الحقائق، لاہور مکتبہ فکر و خیال۔ ۱۹۸۵ء

جمیل الدین عالی (اداریہ) شش ماہی غالب، کراچی، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

جیلانی کامران، ترجمے کی ضرورت، مشمولہ، ترجمہ، روایت اور فن

حق نواز، پروفیسر (مرتب) اردو ادب بیسویں صدی میں، لاہور مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۵ء

رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگِ میل پبلیکیشرز، لاہور

شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان اردو اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

صدف فاطمہ، ڈاکٹر، خواتین کے اردو سفر ناموں کا تحقیقی مطالعہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

عبارت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۱ء

عبدالرحمٰن بجنوری، محاسنِ کلام غالب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء

غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، پاکستانی ادب، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۰۵ء

فاخرہ نورین، ڈاکٹر، ترجمہ کاری، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، جون ۲۰۱۴ء

فراق گورکھ پوری، اندازے، ادارہ فروغِ اردو لاہور، ۱۹۲۸ء

فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، ایف ڈی پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

قدیسہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، نصرت پبلیشرز، حیدری مارکیٹ آمین آباد لکھنو ۱۹۸۷ء

کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، پٹنہ بک ایمپوزیم، ۱۹۸۳ء

محمد باقر، آغا، نظم، آزاد، مبارک علی لوہاری دروازہ لاہور، ۱۹۴۷ء

مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

مسعود حسن ادیب، ہماری شاعری، کتاب گھر لکھنو، ۱۹۶۹ء

مسیح الزماں (مرتبہ) اردو تنقید کی تاریخ، اردو اکادمی اتر پردیش، ۱۹۸۳ء

مظفر علی سید، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۴ء

نیاز فتح پوری، انتقادیات (جلد اول) حیدرآباد عبدالحق اکیڈمی، ۱۹۴۴ء

ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء

وحیدالدین سلیم، افادت سلیم (ہمارے شاعروں کی نفسیات) مکتبہ معین الادب، لاہور

وحید قریشی، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۵ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور احتساب، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۸ء

وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۰ء

ہادی حسین، شاعری اور تخیل، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۰ء

رسائل و جرائد

ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۰۰

سہ ماہی سمبل، راولپنڈی، متعدد شمارے

ماہنامہ بنیاد، لمز یونیورسٹی لاہور، جلد چہارم۔جلد پنجم، ۲۰۱۳ء، ۲۰۱۴ء

ماہنامہ فنون، لاہور، شمارہ ۱۳۰

ماہنامہ کتاب، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

معیار، انٹرنیشل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ ۲۔۱، ۲۰۱۰ء

مقالہ جات

''ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی وادبی خدمات''، سعدیہ طاہر، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، نیشل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، جون ۲۰۱۰ء

انٹرویوز

مقالہ نگار کا نجیبہ عارف سے انٹرویو بمقام انٹرنیشل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مقالہ نگار کا شیراز فضل سے انٹرویو بمقام انٹرنیشل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مقالہ نگار کا حمیرا اشفاق سے انٹرویو بمقام انٹرنیشل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد